مآثرِ عجم

تاریخ ادبیات فارسی ایران و برصغیر مع تذکرہ شعراء و مصنّفین

محمد عظیم الحق جنیدی

مکتبہ فانوس لاہور

102296

ضابطہ

مصنف ——— محمد عظیم الحق جنیدی

پیش گفتار ——— ڈاکٹر آفتاب اصغر

ناشر ——— عطیہ قدیر

سرورق ——— مدثر قدیر

بار اوّل ——— ۱۹۷۱ء

بار دوم ——— ۱۹۹۴ء

مقام اشاعت ——— مکتبہ فانوس گوروارجن نگر لاہور

قیمت :- ایک سو بیس روپے

مآثرِ عجم

تاریخِ ادبیات فارسی ایران و برِصغیر معہ تذکرہ شعراء و مصنّفین
۸۲۲ء تا ۱۹۴۱ء

محمد عظیم الحق جنیدی

پیش گفتار
ڈاکٹر آفتاب اصغر

مکتبہ فانوس
گورو ارجن نگر • لاہور

کیسے تجھے سکھاؤں سلیقہ حجاب کا
تیری نظر میں اور ہے مقصد شباب کا
ہرگز گلہ نہیں ترے افکار سے مجھے
سارا فتور ہے یہ فرنگی نصاب کا

قدیر شیدائی

فہرست مضامین

حصہ دوم- تذکرہ و تبصرہ

حرف اول

یہ کچھ زیادہ عرصہ کی بات نہیں جب پڑھے لکھے مسلم گھرانوں میں ایک چھوٹی موٹی لائبریری ضرور ہوتی تھی جس میں فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات کے علاوہ "دیوان غالب" "عجائبات فرنگ" "تذکرہ غوثیہ" "آب حیات" "مقدمہ شعروشاعری" "سفر نامہ بلاد اسلامیہ" "بانگ درا" "شاہنامہ اسلام" جلد اول اور اسی قبیل کی دیگر کتب کے باوجود پنجابی عربی اور فارسی کتب کی تعداد زیادہ ہوتی تھی جن میں طب و حکمت منطق ہیئت نجوم تاریخ و فلسفہ تصوف مذہب اور شعر و ادب کی کتابیں بڑے قرینے اور احترام سے رکھی جاتی تھیں اگرچہ ان میں سے بعض کتب کا ترجمہ اردو زبان میں ہو چکا ہے لیکن گلستاں بوستاں چہار مقالہ تاج المآثر لباب الالباب خزینۃ الاصفیاء فتوح السلاطین اور سیرالعارفین وغیرہ پڑھنے سے جو شیرینی لب و دہن کو میسّر آتی ہے اس کا ذائقہ اردو میں کہاں ------

یہ کتابیں نہ صرف ہمارے گھروں کی زینت تھیں بلکہ ہماری تعلیم و تربیت اور شخصیت کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتی تھیں لیکن حالات و واقعات اور انقلابات زمانہ نے ہمارا وہ محبت و اپنائیت کا ماحول ہی تبدیل کر دیا اور ہم ادب و آداب سے بیگانہ ہوتے چلے گئے فارسی جو کبھی یہاں سرکاری زبان کے طور پر رائج تھی معتوب ہوگئی اور وقت کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافتی زندگی سے کٹتی چلی گئی - اور پھر المیہ یہ ہے کہ فارسی زبان کا علمی و ادبی سرمایہ اور اس کے تخلیق کرنے والے روشن چہروں سے ہم رفتہ رفتہ نامانوس ہوتے جا رہے ہیں-

فارسی زبان و ادب کے قابل احترام اساتذہ جن میں جامعہ کراچی کے ڈاکٹر ساجد اللہ تفہیمی، "ڈاکٹر طاہرہ صدیقی" "ڈاکٹر روشن آراء"- "ڈاکٹر سید جعفر حلیم"- "آقای حمید رضا شیر خدائی" قونصل جنرل ایران- "یونیورسٹی اورئنٹیل کالج کے- "ڈاکٹر آفتاب اصغر"- "نوازش علی شیخ"- "معین نظامی" بہاولپور یونیورسٹی کے "محمد منیر"— نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگوایجز اسلام آباد کے ڈاکٹر صغرا بانو شگفتہ ڈاکٹر مہر نور محمد "ڈاکٹر سرفراز احمد خان" --- "ڈاکٹر سید "سراج الدین"-- "ڈاکٹر کلثوم سراج"-- بلوچستان کے "ڈاکٹر انعام الحق کوثر" --- "ڈاکٹر سلطان الطاف علی" -- نجم الرشید پشاور کے ڈاکٹر کے بی نسیم، مرتضے جعفری" "ڈاکٹر اختر مسعود رضوی"

ڈاکٹر اطاعت یزدان" حیدر آباد کے پروفیسر ڈاکٹر نبی بخش قاضی ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان پروفیسر حضور احمد سلیم "کراچی کے "ڈاکٹر غلام سرور" --- ڈاکٹر عابد علی خان" --- ڈاکٹر مطیع الامام" ملتان کے پروفیسر محمد اسلم انصاری ڈاکٹر "بشیر انور" - ڈاکٹر ممتاز غفور صاحبہ" لیہّ کے ڈاکٹر خیال امروہوی" کے علاوہ ایران کے کلچرل کونسلر "آقای مرندی" مرکز تحقیقات ایران و پاکستان کے ڈائریکٹر اور رئیس کتاب خانہ گنج بخش ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی" ایران کلچرل سنٹر لاہور کے مہتمم ڈاکٹر "محمد رضا حافظ نیا" ایران کلچرل سنٹر ملتان کے مہتمم آقای جوّاد ذاکری" ایران کلچرل سنٹر حیدر آباد کے مہتمم "آقای ذوالفقاری" ایران کلچرل سنٹر کراچی کے مہتمم "آقای نظری" ایران کلچرل سنٹر کوئٹہ کے مہتمم "آقای اسدی" ایران کلچرل سنٹر پشاور کے مہتمم آقای ابو طالبی" اور ملک کے دیگر تدریسی اداروں کے اساتذہ ------ گلشن پاک میں فارسی کے پودے کی حفاظت و آبیاری میں برس ہا برس سے مصروف ہیں تاکہ نہ صرف ہم اپنی عظمت رفتہ سے ہم کنار ہو سکیں بلکہ پاکستان کی سیاسی تمدنی عمرانی اور علمی تاریخ میں ایک سنہری دور کا آغاز ہو سکے۔

زیر نظر کتاب تاریخ ادبیات فارسی پر اردو زبان میں ایک اعلیٰ تحقیق ہے اور میرے نزدیک متذکرہ اساتذہ فارسی کی مخلصانہ کوششوں کا اعتراف کرنے کیلئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ اسے زیور طباعت سے آراستہ کرکے ان کی خدمت میں پیش کردوں تاکہ ملک و قوم کا یہ ادبی سرمایہ ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے اور جن اساتذہ و تلامذہ کی نظر سے یہ کتاب نہیں گذری انہیں آسانی سے میسّر آجائے - میرا خیال کہاں تک درست ہے اس کے لئے مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

۱۹- جولائی ۱۹۹۴ | امین الدین قدیر

سٹریٹ نمبر ۳ گوردارجن نگر لاہور - ۷

پیشگفتار

بے شک فارسی زبان دنیا کی قدیم ترین اور عظیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ فارسی زبان و ادب کا وجود ظہور اسلام سے صدیوں پہلے بھی تھا لیکن ان کو صحیح معنوں میں قوت و رفعت اور عظمت و شوکت اس وقت ملی جب آج سے تقریباً چودہ صدیاں پہلے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت ۱۶ ہجری میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے جنگ قادسیہ میں آخری ساسانی شہنشاہ یزدگرد سوم کو شکست فاش دے کر ایران کے پایہ تخت مدائن پر اسلامی پرچم لہرایا

پہلی صدی ہجری کے ربع اول میں ایران پر حاملان اور کاملان قرآن عربوں کے قبضہ کے نتیجہ میں دیکھتے ہی دیکھتے ایران کی کایا پلٹ گئی اور نہ صرف یہ کہ کم و بیش تمام ایرانی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے بلکہ ان کی زبان رسم الخط لباس طرز بودوباش ادب آداب غرض ان کا سب کچھ بدل گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا دین کیا بدلا ان کی دنیا ہی بدل گئی وہ زندگی کے ہر شعبہ میں عربوں سے بڑھ کر عرب بن گئے تو بیجا نہ ہو گا۔

بنو امیہ کی حکومت تو ایک خالص عرب حکومت تھی البتہ بنو عباس کے دور حکومت (۱۳۲ - ۶۵۶ھ) میں، جو کہ اپنی ترکیب کے اعتبار سے عرب ایرانی تہذیب و تمدن کا امتزاج تھی، دو نیم خود مختار حکومتوں، طاہریوں اور صفاریوں کے توسط سے فارسی زبان و ادب کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا۔ ان کے بعد سامانی دور کا آغاز ہوا جسے بجا طور فارسی زبان و ادب کے احیاء کا دور کہا جاتا ہے۔ اسی دور میں ایران میں فارسی کا پہلا نامور شاعر، رودکی سمرقندی اور پاکستان میں فارسی کی سب سے پہلی شاعرہ رابعہ بنت کعب خزداری پیدا ہوئے۔

سامانی دور کے بعد غزنوی دور کا آغاز ہوا۔ جو فارسی زبان و ادب کی درخشاں تاریخ میں "طلائی دور" کہلاتا ہے سلطان محمود غزنوی (۳۸۷-۴۲۱) کے دور میں جو کہ بانیان پاکستان کی صف میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے فارسی زبان و ادب کی شہرت و مقبولیت ترکستان ایران افغانستان اور پاکستان سے ہوتی ہوئی سومنات تک جا پہنچی جسے اس بت شکن سلطان نے ایک کم ہزار سال پہلے ۴۱۶ ہجری میں فتح کیا یاد رہے کہ فتح سومنات کے موقعہ پر فرخی سیستانی نے جو قصیدہ تہنیت پیش کیا تھا وہ آج بھی سی ایس ایس (c.s.s) کے فارسی کے نصاب میں شامل ہے اسی غزنوی دور میں لاهور میں مسعود سعد سلمان لاهوری جیسے شاعر

اور سید علی بن عثمان ہجویری رحمتہ اللہ علیہ (داتا صاحب) صاحب کشف المجوب جیسے زندہ جاوید نثر نگار منصۂ شہود پر آئے ان کی تصانیف آج بھی ترکستان' ایران' افغانستان اور پاکستان پر محیط تمام دنیائے فارسی میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں

جب ۶۱۶ ہجری میں چنگیز خان نے مسلمانوں کے تہذیبی مراکز سمرقند و بخارا اور بلخ و بدخشاں اور ۶۵۱ ہجری میں اس کے پوتے ہلاکو خان نے عظیم اسلامی مرکز بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو سلطان محمد غوری کے غلام قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ۶۰۲ ہجری میں لاھور میں قائم ہونے والی سلطنت نے وہاں سے ہجرت کرنے والے ہزاروں فارسی علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کو اپنی آغوش عاطفت میں لے لیا جس میں فارسی کے سب سے پہلے تذکرہ نویس سدید الدین محمد عوفی صاحب جوامع الحکایات ولوامع الروایات برصغیر کے اولین فارسی تاریخ نویس حسن نظامی نیشاپوری صاحب تاج المآثر منہاج سراج صاحب طبقات ناصری اور امیر خسرو صاحب تاریخ علائی جیسی نابغہ روز گار شخصیات پروان چڑھیں سلطنت لاھور جو مغل اعظم' اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت (۱۰۶۷-۱۱۱۸ھ) میں جس کے بارہ میں مفکر پاکستان' علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے

"درمیان کارزار کفر و دین
ترکش ما را خدنگ آخرین"

پھیلتے پھیلتے برما سے بدخشاں اور راس کماری سے بحیرہ عرب تک پھیل گئی اور فارسی زبان و ادب نے اس تمام مملکت کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ہمارے ترکش کے اس آخری تیر کے خطا ہو جانے یا دوسرے لفظوں میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے بعد عظیم مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوکر لال قلعہ کے اندر سمٹ کر رہ گئی اور (۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) میں اس کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر وطن سے بے وطن کیا ہوا اس کے جلد ہی بعد فارسی بھی جلا وطن ہوگئی اور اس کی جگہ انگریزی نے لے لی فارسی کے علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کہ کبھی شاہجہان جن کے منہ موتیوں سے بھرا کرتا تھا اور سونے میں تلوایا کرتا تھا بیک جنبشِ قلم جاہل اور انگریزی داں عالم فاضل بن گئے لیکن خوش قسمتی سے فارسی کے خاکستر میں اب بھی غالب اور اقبال جیسی چنگاریاں موجود تھیں جو اپنے اندر شعلۂ جوالہ بننے کی صلاحیت رکھتی تھیں

بہادر شاہ ظفر کا استاد اور اردو کا عظیم شاعر' جو کہ فارسی زبان و ادب کا دلدادہ تھا' بے

اختیار پکار اٹھا:-

"فارسی بین تا ببینی نقش ھای رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است"

"رومی عصر مصوّرِ پاکستان اور شاعرِ اسلام نے بھی اپنے آفاقی پیغام کے اظہار و ابلاغ کے لئے اردو کی بجائے فارسی ہی کو اپناتے ہوئے فرمایا:

گرچہ "اردو" در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیرین تر است

فارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام"

اس طرح سے حکیم الامت اقبالؒ نے اپنی مسیحا نفسی سے نہ صرف ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی بلکہ پاکستان میں' جو کہ بلاشبہ عظیم مغلیہ سلطنت کا سیاسی اور تہذیبی وارث ہے' اپنے فارسی کلام کی وساطت سے فارسی کو ایک بار پھر سے زندہ کر دیا۔

عام خیال یہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد فارسی کو پاکستانی معاشرہ میں اس کا جائز مقام ضرور ملے گا اور نہیں تو اقبال شناسی ہی کے لئے سہی۔۔ لیکن افسوس کہ وطن عزیز میں انگریز کے معنوی فرزندوں نے فارسی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ شاید اس لئے کہ پاکستان کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اقبال کا حیات آفرین پیغام نہ سمجھ سکیں' اپنی شاندار تاریخ سے آگاہ نہ ہو سکیں' سید علی ہجویریؒ' مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو نہ جان سکیں اور ترکستان' ایران اور افغانستان سے لسانی اور تہذیبی روابط برقرار اور استوار نہ کر سکیں۔

آج جب کہ پاکستان میں فارسی زبان و ادب کے شائقین ارباب اختیار کی حد سے گزری بے نیازی کے باعث مایوسی کے گھپ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں "ماثر نجم" کی اشاعتِ جدید روشنی کی ایک کرن کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو یقیناً پاکستان میں فارسی کے چاروں جانب محیط تیرگی کو کم کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو گی۔

محمد عظیم الحق جنیدی علیگ کی یہ بیش بہا تصنیف' جو کہ فارسی زبان و ادب کی صدیوں

طویل تاریخ پر محیط ہے' تقریباً نصف صدی پہلے پہلی بار ۱۹۴۱ء میں آگرہ میں شائع ہوئی تھی' اب پاکستان میں فارسی زبان و ادب سے متعلق کتب کے قحط کے پیش نظر جناب قدیر شیدائی کے حسن التفات اور فارسی دوستی کی وجہ سے دوبارہ زیور طباعت سے آراستہ کی گئی ہے۔ امید ہے یہ تشنگانِ زبان و ادبیات فارسی کے لئے بارش کا پہلا قطرہ بلکہ باران رحمت ثابت ہو گی اور متعلقہ حلقوں میں مطلوب و محبوب ہو گی۔

یہ مختصر مگر جامع کتاب' جو کہ تقریباً دو سو چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ زبان و ادبیات فارسی کے کئی دھاروں تاریخ ادبیات فارسی قبل از ظہور اسلام تاریخ ادبیات قدیم ترکستان' ایران اور افغانستان' تاریخ ادبیات برصغیر ہندو پاکستان اور تاریخ ادبیات فارسی معاصر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ گویا کوزے میں دریا بند ہے۔ فاضل مصنف نے اس تصنیف میں مستند ترین منابع اور تحقیق و تنقید کے اصول و مبانی سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے فارسی زبان و ادبیات کی طویل تاریخ کو انتہائی دلنشین اسلوب میں سپرد قلم کیا ہے۔ امید واثق ہے کہ یہ کتاب نہ صرف پاکستانی جامعات کے فارسی کے تلامذہ اور اساتذہ بلکہ سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امیدواروں اور عام شائقین کے لئے بھی نہایت مفید ثابت ہو گی۔

ڈاکٹر آفتاب اصغر

شعبہ فارسی یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۵۔ جولائی ۱۹۹۴ء

حصّہ اوّل

تاریخ ادب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

ادبِ قدیم

زبان

ایرانِ قدیم کی علمی اور ادبی ترقی بڑی حد تک پردہ خفا میں ہے اور ہم اعتماد کے ساتھ اس زمانے کی لسانی کیفیت کو نہیں بیان کر سکتے۔ تاہم یہ ضرور تحقیق ہے کہ دورِ ساسانی کی زبان پہلوی تھی اور چونکہ یہ زبان موجودہ فارسی کی پیش رو تھی اس لئے اس کو بعض مصنفین فارسی قدیم بھی کہتے ہیں۔ غلبہ اسلام کے بعد عربی کے امتزاج سے یہی زبان موجود فارسی بن گئی۔

زبانِ پہلوی کی وجہ تسمیہ کے متعلق کئی روایات ہیں۔ بعض کا بیان ہے کہ پہلو شہر کو کہتے تھے۔ اور چونکہ یہ اہلِ شہر کی زبان تھی اس لئے پہلوی کہلائی فردوسی نے لکھا ہے۔ ع:۔ "ز پہلو برون رفت کاؤس شاہ"۔
بعض کا بیان ہے کہ اگرچہ پہلو کے معنی شہر کے ہیں لیکن اس زمانہ میں شہر کا

اطلاق اصفہان، رے اور ہمدان پر ہوتا تھا اور ان شہروں میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔ اس لئے اس کو پہلوی کہتے تھے۔ دوسرے شہروں کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ موّرخین اور لغت نویسانِ فارسی نے اس کے علاوہ چند اور زبانوں کے نام لکھے ہیں۔ مثلاً دری۔ یہ درہ کوہ کے نواح کی زبان تھی۔ اور ادبا اور شعراء کو مرغوب تھی ۔

کیے تازہ کن قصۂ زردشت
بنظمِ دری و بخطِ درشت

اس کے علاوہ دربارِ سلطانی میں بھی یہی زبان بولی جاتی تھی۔ (۲) خوزی سلاطین اور شرفا خلوتِ خاص میں اور مقربانِ خصوصی سے اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ (۳) سریانی یہ علمی زبان تھی۔ (۴) سغدی۔ ماوراءالنہر اور مشرقی ایران کی زبان تھی۔ (۵) زاولی۔ زابل میں بولی جاتی تھی۔ (۶) سگزی سیستان کی (۷) اور ہروی، ہرات کی زبان تھی۔

ان زبانوں میں اور پہلوی میں کوئی اساسی فرق نہ تھا۔ لب و لہجہ ضرور ہر ایک کا الگ الگ تھا اور بعض الفاظ بھی ایسے تھے کہ جو مشترک نہ تھے۔

نثر عہدِ ساسانی کی تصانیف کے متعلق یہ ہے کہ "کتب خانۂ عجم قبل از اسلام" کا تذکرہ تواریخ میں کثرت سے ملتا ہے۔ نیز عہدِ ہخامنشی کا کتب خانہ جو سکندر کے حملہ کے وقت اس کے امراء کے ہاتھ لگا اور جس کی کتابوں کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا گیا بہت مشہور ہے۔ اس وقت ہمیں صرف تراجم کا پتہ چلتا ہے۔ اصل فارسی نسخے معدوم ہو چکے ہیں۔ اس دور کی جو تصنیفات باقی ہیں وہ زیادہ تر اوستا اور اس کے مختلف حصوں کی شرحیں ہیں۔ اسی لئے ہم اس عہد کی کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک اوستا کی تفاسیر اور عقاید کی کتابیں۔ دوسری نجوم، ریاضیات، تاریخ و لغت وغیرہ کی

کتابیں۔ ان میں سے جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سے بعض کے اصل اور ترجمے دونوں موجود ہیں اور بعض کے صرف ترجمے ملتے ہیں۔

صاحب الفہرست نے ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو پہلوی سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ اور چوتھی صدی میں اُن کی اصل اور ترجمہ دونوں موجود تھی (۱) خدائی نامہ (خوتائی نامک) سلاطینِ ایران کی تاریخ جو بعض کے نزدیک یزدجرد شہریار کے زمانہ میں لکھی گئی۔ عبداللہ بن مقفع نے دوسری صدی ہجری میں عربی میں ترجمہ کی۔ (۲) آئین نامہ (۳) مزدک (مزدک نامہ) (۴) تاج در سیرت انوشیراں (۵) الادب الکبیر (۶) الادب الصغیر (۷) الیتیمہ۔ یہ سب پہلوی سے ابن مقفع نے ترجمہ کیں اور اُن کا مبحث تاریخ و ادبیات و اخلاق ہے (۸) سیر ملوک العجم (تاریخ و آداب ملوکِ عجم) اس کتاب کے کئی ترجمے ہیں۔ (۹) رستم و اسفندیار (۱۰) بہرام شوس۔ ان دو ادبی کتابوں کا ترجمہ جبلہ بن سالم نے پہلوی سے عربی میں کیا (۱۱) شہریزاد و اپرویز (۱۲) دارا و بت زریں (۱۳) بہرام و نرسے (۱۴) خرس وردباہ (۱۵) افسانہ گشت و گزار (۱۶) مشک زنانہ و شاہ زنان۔ (۱۷) زیج شہریار یا زیج شاہ (پہلوی میں زیک شہرایار) (۱۸) یادکار زریران (یات کار زریران) (۱۹) وصیت انوشیرداں بہرمزد جواب او (۲۰) نامۂ انوشیرداں بمرزبان و جواب او (۲۱) قصہ شیریں و فرہاد (۲۲) قصۂ زال و رودابہ (۲۳) قصۂ بیژن و منیژہ۔ یہ سب رزم بزم کی کتابیں ہیں جو پہلوی سے فارسی میں غلبۂ اسلام کے بعد ترجمہ کی گئیں۔

نظم اگرچہ فارسی شاعری کے ابتدائی مدارج ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ لیکن آثار عجم سے ہم اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابتداءً نظم کی دو قسمیں تھیں۔ ایک گیت دوسری رجز۔ ابتدائی گیتوں کے نمونے ہم تک نہیں پہنچے، رجز کا بہترین نمونہ یادگار زریران ہے۔ اوستا مصنفہ زرتشت کے گاتا میں قدیم ترین ایرانی نظم کے صحیح نمونہ ملتے ہیں۔

اس کے دوسرے حصہ یشت میں جو مناجاتیں ہیں وہ بڑی حد تک منظوم ہیں
ایرانیوں نے ملک کے غیر مذہبی ادب کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور
شاید اسی وجہ سے پہلوی زبان میں فنی، علمی اور خصوصاً نظم کی کتابیں بہت کم
ملتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی راگوں اور گانے والوں کا تذکرہ جابجا ملتا ہے۔ عہدِ
ساسانی کا ادبی ذخیرہ گیتوں، نقشوں، اور حکایتوں پر مشتمل ہے اور تقاریب
کے موقعوں پر ساسانی بادشاہوں کے محل نغموں کی آواز سے گونجتے سنائی دیتے
تھے۔ خسروانِ ایران فنِ موسیقی کے بڑے قدردان تھے اُن کے درباروں
میں گانے بجانے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ سارکس اور باربد کے نام اسی زمانہ
کی یادگار ہیں۔ اور مربیانِ موسیقی میں خسرو پرویز کا نام ہمارے دعوے کی
دلیل ہے۔

اگرچہ ایرانِ قدیم کی شاعری قافیہ ردیف سے معرّا تھی لیکن بحر اور
وزن ضرور ہوتا تھا۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ دیہاتی گیتوں کا
ترنم الفاظ کی ترتیب پر منحصر ہوتا تھا اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ
ایرانِ قدیم کے گیتوں میں بحر اور وزن ہوتا تھا اور وہ بڑی حد تک عرب
جاہلیت کے رجز سے مشابہ ہوتے تھے۔
عہدِ ساسانی میں شاعری کے وجود سے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا
پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ عبداللہ ابن المقفع نے کلیلہ دمنہ (عربی) کے دیباچہ میں لکھا
ہے کہ جب حکیم برزویہ ہندوستان سے کلیلہ دمنہ کا مسودہ لے کر واپس آیا
تو نوشیرواں عادل نے حکم دیا کہ ایک عظیم الشان جشن برپا کیا جائے۔ اس
میں تمام ملک کے شاعر، اور خطیب شرکت کریں اور اپنے کمالات کی
نمائش کریں۔

۲- بہرام گور کے متعلق جو حکایت مشہور ہے۔ اس میں اس کو ایران قبل از اسلام کا پہلا شاعر بتایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ دعوے غلط ہے لیکن اس سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں پہلوی شاعری کا وجود تھا۔

۳- اسی طرح یہ قصہ کہ قصر شیریں پر خسرو ثانی (۶۲۸-۵۹۰ ء) نے مندرجہ ذیل شعر کندہ کرایا تھا۔ واقعات کی شہادت پر ناقابل قبول ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ عہد ساسانی میں اس قسم کی شاعری ہوتی تھی

ہژبرا بگیہاں انوشہ بذی

جہاں را بدید ار توشہ بذی

۴- اس کے علاوہ اس زمانہ کے نغموں اور گیتوں کے نام مثلاً لحن خسروانی وغیرہ جو آج تک موجود ہیں۔ اور ان میں سے اکثر اسلامی عہد میں مستعمل تھے۔ اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ عہد ساسانی میں موسیقی کے ساتھ شاعری بھی موجود تھی۔

۵- نیز مندرجہ ذیل شاعرانہ اصطلاحات پہلوی شاعری کی یادگار ہیں:-
پساوند۔ سرواد (قصیدہ) چکامہ (غزل) چامہ (قطعہ)

۶- زرتشتیوں کا یہ گیت جو تاریخ سیستان میں درج ہے۔ اس میں اس زمانہ کی اگر صحیح نہیں تو مسخ شدہ شاعری کا نمونہ ضرور ہے۔

فرخنت بادا روشن | خنیدہ گرشاسب ہوش
ہمی پرست از جوش | نوش کن می نوش
دوست بدا گوش | بآفرین نہادہ گوش
ہمیشہ نیکی گوش | دی گذشت و دوش
شاہا خدایگانہ | بآفرین شاہی

ایران پر اسلامی تسلط کے بعد زبان اور تمدن کے احیار اور ترویج میں

پوری دو صدیاں صرف ہوئیں۔ عربوں نے قدیم ایرانی علمار اور صاحبانِ فن کی خواہ کسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں قدر کی اور اُن سے ایرانی علوم وتمدن کے احیار میں مدد حاصل کی اسلام کے عہد زریں کا بھی یہی زمانہ تھا۔ جب کہ عباسیوں کی سرپرستی میں عربی علوم وفنون کی ترقی ہوئی۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران کے نقطۂ نظر سے یہ زمانہ دورِ انقلاب ہے۔ جس میں پہلوی اور عربی کے امتزاج سے ایک دوسری زبان فارسی جدید پیدا ہورہی تھی۔

فارسی شاعری میں اوّلیت کا مرتبہ مختلف حضرات کو عطا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر ایک کے متعلق ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جس کی بنیاد پر اس کو اس مرتبہ کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ ہم ذیل میں ان سب حکایتوں کا ذکر کر کے بتائیں گے کہ وہ کن وجوہ کی بنا پر ناقابل قبول ہیں۔

۱۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بہرام گور ایک مرتبہ اپنی محبوبہ دل آرام کے ساتھ شکار کو گیا ہوا تھا۔ وہاں ان دونوں نے مل کر مندرجہ ذیل شعر نظم کیا۔

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ
نام بہرام ترا و پدرت بو جبلہ

لیکن یہ دعویٰ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ بہرام ۴۲۰ء سے ۴۳۸ء تک حکمران رہا۔ اس زمانہ میں اگر فارسی شاعری کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ ابھی گہوارہ کی منزل سے نہ نکلی تھی۔ پھر یہ کس طرح مان لیا جائے۔ کہ اس زمانہ میں ایک ایسا شعر تصنیف کیا جا سکتا ہے۔ جو عربی اور فارسی کے مشترکہ عروض کا نتیجہ ہو۔ درآنحالیکہ اس زمانہ میں موجودہ فارسی کا وجود بھی نہ تھا۔

۲۔ عباس مروزی کا وہ قصیدہ جو اس نے ۸۰۸ء میں خلیفہ المامون

کے مرو میں آنے کے موقع پر پیش کیا۔ اس واقعہ کو نہ معلوم کیوں اس قدر صحیح سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر تذکرہ نویس بغیر کسی تحقیقات کے درج کرتا ہے۔
عوفی کے بیان کے مطابق قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین
گسترانیدہ بجود و فضل در عالم ید بین

مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را
دین یزداں را تو بائستہ چو رخ را ہر دو عین

اس قصیدہ میں جس کے صرف چار شعر ہم تک پہنچے ہیں۔ آگے چل کر مروزی نے لکھا ہے:-

کس بریں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت
مر زبانِ پارسی راہست تا ایں نوع بین

لیک از آں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت
گیرد از حمد و ثنائے حضرت تو زیب و زین

اگر اس نظم کو عروض، بحر وغیرہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اُس کو دوسری صدی ہجری کی نظم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کو دیکھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف پانچویں یا چھٹی صدی ہجری ہوگا جب کہ عہدِ قدیم کی سلاست ختم ہو چکی تھی اور خاقانی کی لفاظی اور عربی اور ترکی محاورات الفاظ اور تراکیب رواج پا چکی تھیں۔ حنظلہ بادغیسی، فیروز مشرقی اور رودکی کے کلام میں اور اس میں کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔
عباس مروزی کی حمایت میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ یہ نظم بحر رمل مثمن مقصور (محذوف) میں ہے۔ اور یہ بحر فارسی کے لئے مخصوص ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ عربی عروض کے بانی خلیل بن احمد کا انتقال

۸۹۱ء میں ہوا ہے تو کیا آپ یہ تسلیم کر لیں گے کہ صرف ۸ برس (۸۰۸ء) کے عرصہ میں اہلِ ایران نے عربی عروض کو ترمیم کے بعد اپنے مذاق کے مطابق بنا لیا۔ اور عباس مروزی نے اس ترمیم شدہ بحر میں ایک ایسا بہمہ وجوہ مکمل قصیدہ لکھا؟۔

۳۔ ابو حفص حکیم فارسی کا قدیم ترین شاعر تھا۔ اور اس کا یہ شعر

آہوے کوہی در دشت چگونہ بودا
یار ندارد بے یار چگونہ رودا

سب سے پہلا شعر ہے۔ شمس قیس نے اپنی کتاب "معجم فی معائر اشعار العجم" میں فارابی (متوفی ۹۵۰ء) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابو حفص ایک لائق مطرب تھا۔ شاہ رود اسی کی ایجاد ہے۔ سنہ ۳۰۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس صورت میں ہم یہ تو تسلیم کر لیں گے کہ اس شعر کی زبان زمانہ تصنیف کے مطابق ہے لیکن یہ اعتراض پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اولیت کا تاج ابو حفص کے سر پر کیوں رکھا جائے۔ جب کہ اس سے پہلے تیسری صدی ہجری میں حنظلہ بادغیسی (۸۵۰ء) فیروز مشرقی (۸۹۰ء) اور ابو سلیک گرگانی (۸۹۳ء) شاعری میں نام پیدا کر چکے تھے۔

۴۔ اسی طرح یہ واقعہ کہ ایک روز یعقوب بن لیث کے لڑکے نے کھیلتے میں گولی کو گڑھے میں گرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو" اور یعقوب نے اس فقرے کی موزونیت دیکھ کر ابو دلف عجلی اور ابن الکعب کو حکم دیا کہ اس کی بحر معلوم کر کے تضمین کریں تاریخی شہادت کے مطابق صحیح نہیں۔

امیر ابو دلف عجلی کا انتقال ۲۲۵ھ میں ہوا ہے اور اس وقت یعقوب بن لیث کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس لئے کہ طاہر بن عبد اللہ خراسان کا حکمران تھا۔ اس کے علاوہ وہ کبھی ایسا بااثر امیر نہیں ہوا کہ ابو دلف اور ابن الکعب

جیسے اہل قلم اس کے دامن دولت سے وابستہ رہے ہوں۔

اس گفتگو کے بعد یہ تو طے ہو گیا کہ قدیم فارسی تذکروں نے شاعر اول اور شعر قدیم کے متعلق جو روایات بیان کی ہیں اور اُن سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ ہر اعتبار سے غلط اور لغو ہیں۔ صحیح واقعات کا انکشاف عربی تاریخ سے ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی گئی ہے۔ اس کا ملخص ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

۱۔ یزید بن مفرغ کے یہ مصرعے جن میں زیاد بن ابیہ کی ماں سمیہ پر طنز ہے۔ یزید بن معاویہؓ کی خلافت کے زمانہ سے متعلق ہیں۔ اور اس کا دور خلافت سنہ ۶۸۰ء سے سنہ ۶۸۲ء تک تھا۔

آبست نبیذ است عصارات زبیب است سمیہ روسپیذ است

۲۔ خراسان کے بچوں کا وہ طنزیہ گیت جو اسد بن عبد اللہ القسیری کی الختلونی کی خاقان سے شکست کے موقع پر گایا گیا سنہ ۷۲۶ء کی تصنیف ہے۔

از ختلاں آمدیہ برو تباہ آمدیہ
آبار باز آمدیہ خشک نزار آمدیہ

۳۔ ابو الینبغی العباس بن طرخان کا وہ شعر جو سمرقند کے دروازہ پر کندہ ہے۔

سمرقند کند مند بذینت کی افگند
از شاش نہ بہی ہمی شہ نہ جہی

کتاب الوزراء سے ہم کو اس شاعر کے متعلق اتنا اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جعفر برمکی اور فضل برمکی کے دربار سے وابستہ تھا۔ خاندان برمکی کا زوال سنہ ۸۰۳ء کا واقعہ ہے

۴۔ دور صفاریہ کا مشہور شاعر محمد بن واصف تھا۔ اس کے قصائد یعقوب کی شان میں اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اسی لئے فارسی شاعری کی ابتدا کا حال بھی نہیں کھلا۔ تاریخ سیستان کے مصنف کے بیان کے مطابق یہ پہلا فارسی شاعر تھا جس نے کامیابی کے ساتھ نظم لکھی۔

(۲)

ماقبل دورِ غزنویہ

(۸۲۲ — ۹۹۵ء)

طاہریہ خلافت بغداد کے زوال کے زمانہ میں مختلف چھوٹی چھوٹی سلطنتوں نے مرکز خلافت سے قطع تعلق کر کے آزادی کا اعلان کر دیا تھا طاہر ذوالیمینین بارگاہ خلافت کا نبرد آزما سپہ سالار تھا اور اس کی جنگی خدمات کے صلہ میں خلیفہ مامون الرشید نے خراسان کی گورنری اس کو عطا فرمائی تھی۔ خلافت کے زوال کے وقت یہ پہلی سلطنت تھی جو تقریباً آزاد تھی۔ خراسان دارالخلافہ سے کافی دور تھا۔ طاہری دربار تمام سازو سامان سے آراستہ تھا۔ چونکہ دربار میں شاعر کا ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے شعر و شاعری کا تذکرہ ہوا۔ اور یہ پہلا خاندان تھا جس نے فارسی شعرار کی قدر کی اور فارسی شاعری کا سنگِ بنیاد انھیں کے ہاتھوں رکھا گیا۔ خراسان کی زبان آسان پہلوی تھی۔ جو عربی الفاظ اور تراکیب سے مطلقاً عاری تھی۔ اس دربار کے مشہور شعرار (۱) حنظلہ بادغیسی (۲) محمود وراق (۳) اور فیروز مشرقی تھے۔ حنظلہ بادغیسی پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ شاعری کی۔ صاحب چہار مقالہ کا بیان ہے کہ وہ صاحب دیوان تھا۔ اس نے ۸۲۱ء میں انتقال کیا۔

محمود وراق (المتوفی ۲۲۱ھ) محمد بن طاہر آخری تاجدار خاندان طاہریہ کے دربار کا شاعر تھا۔ فیروزہ مشرقی اصلاً یمن کا باشندہ تھا۔ اس کو خاندان طاہریہ کے زوال کے بعد دربار صفاریہ سے وابستگی ہو گئی۔ اس کا انتقال ۹۰۵ء میں ہوا۔

صفاریہ خاندان طاہریہ (۸۲۲ - ۸۷۲ء) کا آخری تاجدار محمد بن طاہر تھا۔ جس کو ۸۷۲ء میں یعقوب بن لیث نے مغلوب کیا۔ اور خاندان صفاریہ کی حکومت قائم ہوئی جس نے تقریباً دس سال تک حکومت کی اس چندروزہ حکومت کے عہد میں کئی شاعر پیدا ہوئے۔ جنھوں نے فارسی شاعری کی پرورش کی۔ اس خاندان کا مشہور شاعر (۱۴) ابوسلیک گرگانی تھا۔

اصناف شاعری میں رباعی کی ایجاد اسی عہد میں ہوئی۔ اس کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ یعقوب کا کم عمر لڑکا اخروٹوں سے کھیل رہا تھا کہ ایک اخروٹ آہستہ آہستہ لڑھکتا ہوا ایک گڑھے میں جا گرا۔ بچہ اس نظارہ سے متاثر ہوا اور بیاختہ پکار اُٹھا۔ ع "غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گو" یعقوب بھی اتفاقاً اس جگہ موجود تھا۔ فقرہ کی موزونیت دیکھ کر شعراء دربار کو حکم دیا کہ اس مصرع کی بحر کا تعین کریں۔ اور اس پر تضمین کریں چنانچہ تین مصرعوں کے اضافہ سے رباعی مرتب کی گئی۔ اور دو بیتی نام رکھا گیا۔

فارسی کی یہ پہلی رباعی ہے۔ جو ۸۶۵ء میں نظم کی گئی۔

سامانیہ فارسی ادب کی حقیقی ترقی خاندان سامانیہ کے عہد میں ہوئی۔ اس سلسلہ کے بادشاہ قدیم شاہان فارسی کے خاندان سے تھے اور اسی لئے انھوں نے اپنی مادری زبان کے ادب کی طرف شاہانہ توجہ کی۔ عربی کے ساتھ فارسی کو بھی درباری زبان کا مرتبہ عطا کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت سے شعراء اور ادبا دربار میں جمع ہو گئے اور شاہانِ سامانیہ نے اُن کی وہ قدر و منزلت کی جو اس سے قبل طبقۂ شعراء کو نصیب

نہ ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں عربی زبان سے بہت سی مفید کتابوں کا فارسی ترجمہ کیا گیا۔

۹۷۰ء میں منصور اوّل کے ایما سے اس کے وزیر (۵) ابو علی بن محمد نے تاریخ طبری کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ فارسی نثر کی سب سے قدیم کتاب شمار کی جاتی ہے۔ کلیلہ دمنہ شروع میں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔ لیکن اس کے عربی ترجمہ کے بعد فارسی کا نسخہ تلف ہو گیا اس لئے نصر بن احمد سامانی کے حکم سے (۶) رودکی نے دوبارہ اس کو فارسی میں نظم کیا۔ سامانی دربار پر شاعری کچھ اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ جب نوح بن منصور کو تاریخ عجم کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا تو (۷) دقیقی کو مامور کیا گیا کہ وہ نظم میں شاہانِ سلف کے کارنامے اور حالات بیان کرے۔ وہ تقریباً ایک ہزار شعر لکھ پایا تھا کہ اپنے غلام کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ دقیقی کا یہ شاہ نامہ فردوسی کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوا۔ اس عہد کے ایک مشہور شاعر (۸) ابوشکور بلخی نے سب سے پہلی مثنوی لکھی اور (۹) شہید بلخی نے سب سے پہلے ردیف وار دیوان مرتب کیا۔

اس دور میں شعر و شاعری کی ترقی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ مذاق عورتوں تک میں پیدا ہو گیا تھا (۱۰) رابعہ قزداری اسی عہد کی ایک بلند مرتبہ اور رنگین نوا شاعرہ تھی جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی۔ دربارِ سامانیہ کے دوسرے مشہور شعرا۔ (۱۱) ابو عبد اللہ بن موسیٰ (۱۲) عمارہ مروزی تھے۔

اسی زمانہ میں صاحب اسمٰعیل بن عباد اور شہزادہ شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دربار بھی شعرا اور ادبا کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ یہ دونوں چونکہ خود صاحب ذوق اور عالم تھے اس لئے ان درباروں نے بھی فارسی

ادب کی کافی خدمت کی ہے۔
صاحب اسمٰعیل کے دامن دولت سے (۱۳) منصور بن علی المنطقی الرازی (۱۴) ابو عبداللہ محمد الجنیدی (۱۵) اور ابو بکر محمد بن علی خسروی السرخسی جیسے شعراء وابستہ تھے اور (۱۶) ابو بکر محمد بن علی خسروی السرخسی اور (۱۷) ابوالقاسم زیاد شمس المعالی کے دربار میں نغمہ سنجی کرتے تھے۔

غزنوی اقتدار کے ساتھ ساتھ گیارہویں صدی عیسوی میں تمام دوسری سلطنتیں ختم ہوگئیں۔ اس خاندان کے بعض بادشاہ خود بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک صدی کے عرصے میں فارسی زبان نے اتنی ترقی کر لی کہ فصاحت اور زورِ بیان میں عربی کا مقابلہ کرنے لگی۔

اسلامی فتوحات کے بعد صرف عربی ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور شعراء اور نثار اسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ شاہانِ وقت کو بھی فارسی کی سرپرستی کی طرف توجہ نہ تھی۔ عرب ایران کی ترقی میں کبھی حائل نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ایران کو پستی کے اس مہیب غار سے نکالا جہاں وہ صدیوں سے شرک، توہم اور خراب رسموں میں آلودہ پڑا ہوا تھا۔ اور اسلام کی روشنی سے ایران کا گوشہ گوشہ روشن ہو گیا۔ اسلام کے اثر سے رواداری، شرافت، آزادی اور ترقی کے جذبات پیدا ہوئے۔ نیند کے ماتے ایرانیوں نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ وطن کا زمین و آسمان بدل چکا ہے۔ عرب اپنے ساتھ علم و ادب کا وسیع خزانہ بھی لائے تھے۔ حکومت کے اثر سے اس چشمہ علم سے تمام ملک سیراب ہوا۔ اور ایرانیوں میں صحیح ذوقِ ادب پیدا ہوا۔ فارسی ادب کا احیا اسی روشنی میں ہوا تو ایرانی جو علم و ادب کی فسوں کاری سے بے خبر تھے۔ اس خوشگوار انقلاب کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ معصیت اور سیاہ کاری نے قلوب میں تفاوت

پیدا کر دی تھی۔ لطیف جذبات کی گنجائش کہاں تھی۔ عربی ادب نے یہ جذبات بیدار کیے۔ اور اب فطرت کے نغموں کی صدا ایرانیوں کے کانوں تک پہنچنے لگی۔ اسلاف کے شجاعانہ کارنامے ان کے دلوں کو گرمانے لگے۔ اور جذبات کی یہ نئی دنیا جو ان کے سینوں میں بھر چکی تھی منظرِ شہود پر آنے کے لئے بیقرار ہوئی۔

اس عہد کے ادب کی خصوصیات میں صفائی اور سلاست اور انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ مضامین شاعری، اسلاف کے کارنامے، جذبات دلی کا اظہار اور مناظرِ قدرت کا بیان تھے۔

رودکی کی مناظر کشی، طرزِ ادا کی سلاست جو سادگی اور پرکاری کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک مضمون کا مسلسل بیان اور (۱۸) دقیقی مصنف شاہنامہ کا جوشِ بیان۔ بے ساختگی اور برجستگی اس عہد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ زبان بڑی حد تک غیر ملکی الفاظ سے پاک رہی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس قدر صاف تھی کہ دسویں صدی کی فارسی شاعری ہمارے لئے اسی قدر آسان ہے جیسی کہ موجودہ شاعری۔ تمام اصنافِ شاعری میں رباعی اور مثنوی پر زیادہ طبع آزمائی کی گئی۔ قصیدہ اور قطعہ تصنع اور مبالغہ سے پاک تھے۔ خیالات صاف اور سادہ تشبیہات سہل اور نیچرل۔ استعارات کا استعمال کم ہے اور جہاں کہیں ہے وہ صاف اور قریب الفہم۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عہد غزنویہ اور سلجوقیہ میں تصنع، مبالغہ، پیچ در پیچ خیالات، مشکل اور بلند آہنگ الفاظ کا استعمال، بعید از قیاس استعارات کی کثرت سرمایۂ شاعری ہو گیا۔ اور فارسی شاعری نے ۱۵۰ برس کی قلیل مدت میں باوجود عربی اثرات کے نیچر کا دامن چھوڑ دیا۔

جب ہم عہد سامانیہ کی شاعری اور نثر پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو کس قدر حیرت ہوتی ہے کہ فارسی زبان و ادب نے اس زمانہ میں ترقی کی وہ

وہ منزلیں طے کر لی تھیں۔ جو یورپ کی جدید زبانوں کی سرحد ادراک سے بھی دور تھیں۔ لیکن فارسی زبان الفاظ کے بیش بہا خزانہ سے مالا مال اور ایک خاص طرز ادا کی مالک تھی۔

---

(۳)

دور غزنویہ

(۹۹۸ —— ۱۰۴۴ء)

سلطان محمود غزنوی کا نام ایک فاتح، جنگ جو اور بت شکن بادشاہ کی حیثیت سے مشہور رہے۔ مورخین نے اس کی معرکہ آرائیوں کی اور فتوحات کی داستانیں بڑے جوش و خروش اور دلچسپی سے بیان کی ہیں مگر اس کے ذاتی علم و فضل اور علمی اور ادبی سرپرستی میں صرف فردوسی کی حق تلفی کا واقعہ زبان زد خلائق ہے۔ حالانکہ فارسی زبان و ادب کی جو بے لوث خدمت اس علم پرور سلطان نے کی اور جس کوشش اور سعی سے فضلاء کو دربار میں جمع کیا وہ تاریخ ایران میں بے نظیر ہے۔

خاندان غزنویہ حقیقت میں سلسلہ سامانیہ کی ایک شاخ ہے۔ عبدالملک بن نوح سامانی (المتوفی ۹۶۱ء) کے عہد میں الپتگین جو اس خاندان کا ایک غلام تھا۔ اپنی قابلیت کی بدولت خراسان کا گورنر بنا دیا گیا۔

عبدالملک کی وفات کے بعد الپتگین نے خراسان کو چھوڑ کر غزنی میں قیام کیا اور ۱۶ سال تک وہاں حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابواسحاق تخت نشین ہوا۔ جو چند روز کی حکومت کے بعد رحلت کر گیا۔ ۹۷۶ء

یں سبکتگین نے جو شاہ الپتگین کا ایک غلام تھا اور اپنی قابلیت کی وجہ سے غزنین کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا تخت شاہی پر قبضہ کر لیا اور خاندانِ غزنویہ کی بنیاد رکھی۔ دربارِ سامانی سے اس کو ناصرالدین کا خطاب ملا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل تخت نشین ہوا۔ جس نے بلخ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ سلطان محمود نے جو اس زمانہ میں غزنین میں تھا۔ بھائی سے صلح رکھنی چاہی۔ مگر ممکن نہ ہوا اور ایک معرکہ آرائی کے بعد پوری سلطنت محمود کے ہاتھ آگئی۔ دربارِ سامانی سے سیف الدولہ اور بارگاہِ خلافت سے یمین الدولہ کے خطابات عطا ہوئے۔

سلطان محمود نے ۱۰۳۰ء میں انتقال کیا۔ اور اس کے بعد یہ عظیم الشان عریض وطویل سلطنت کمزور ہاتھوں میں آکر تباہ ہو گئی۔ محمود کے پوتے مودود نے ۱۰۴۴ء میں سلجوقیوں کے ہاتھ سے شکست کھائی۔ اور دولت غزنویہ کا خاتمہ ہو گیا۔

دولتِ غزنویہ کے آغاز میں ایران میں مندرجہ ذیل دربار اپنی علمی سرپرستی اور ماہرینِ فن کی قدردانی کے لئے مشہور تھے۔

(۱) اصفہان میں صاحب اسمٰعیل بن عباد۔

(۲) بخارا میں دربارِ سامانی

(۳) طبرستان میں شمس المعالی قابوس بن وشمگیر

(۴) خیوہ میں مامونی خوارزم شاہی شہزادگان

اس زمانہ میں شعراء اور علماء ایک دربار سے دوسرے دربار میں امراء کی فزوں تر قدردانی سے فائدہ اٹھانے کے لئے جاتے اور ایک نہ ایک کارنامہ صاحب دربار کے نام سے معنون کر کے اس کو زندہ جاوید بنا دیتے۔

(۱) ابومنصور نیشاپوری نے لطایف المعارف صاحب اسمٰعیل کے نام سے معنون کی، سحر البلاغۃ اور فقہ اللغۃ امیر ابو الفضل کے نام اور لطائف وظرائف اور نثر و نظم مامون خوارزم شاہ کے نام منسوب کیں۔ (۲) ابوریحان البیرونی نے ابتدائی زمانہ شہزادگان ماموتی کے دربار میں بسر کیا۔ اس کے بعد شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے دامن دولت سے وابستہ ہو گیا اور داستان اقوام قدیم اس کے نام سے معنون کی۔ اور آخر میں سلطان محمود کے دربار میں آگیا۔ اور اس کے انتقال تک اسی دربار میں رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد "الہند" ایک کتاب لکھی جس کے متعلق ڈاکٹر ساچو نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "ہندو تہذیب اور علوم کے متعلق موجودہ لٹریچر کے مطالعہ سے اتنا علم حاصل نہیں ہو سکتا جتنا اس ایک کتاب سے حاصل ہو جاتا ہے" نجوم کے متعلق ایک رسالہ تفہیم لکھا ہے جس کو ریحانہ بیگم کے نام سے معنون کیا۔ اور ایک مبسوط کتاب نجوم پر "قانون المسعودی" لکھ کر سلطان مسعود بن محمود کے نام سے منسوب کی اور جواہرات کے متعلق ایک محققانہ کتاب خاندان غزنویہ کے آخری تاجدار مودود کے نام سے معنون کی۔

شہزادگان ماموتی خوارزم شاہی کا دربار فضلاء کے اجتماع کے لحاظ سے دولت غزنویہ کے آغاز میں ایک خاص وقعت رکھتا تھا۔ اور جتنے اہل علم و فن اس دربار میں موجود تھے۔ تمام ایران میں مجموعی طور پر نہ تھے۔ (۳) ابو علی ابن سینا۔ مشہور و معروف فلسفی، البیرونی، (۴) ابوسہل مسیحی فلسفی (۵) ابوالحسن خمار طبیب (۶) ابونصر عراق مہندس ۱۰۱۵ء تک اسی دربار کی زینت تھے۔ سلطان محمود نے ایک خط کے ذریعہ سے شہزادہ مامون سے درخواست کی کہ ان کو شاہی دربار میں بھیج دیا جائے۔ ابو علی ابن سینا۔ اور مسیحی کو کچھ وہم پیدا ہوا۔ اور خفیہ طور پر فرار ہو گئے۔ مسیحی راستہ

کی سخت گرمی اور طوفان سے فوت ہو گیا۔ ابو علی سینا بے شمار مصائب اٹھاتا اور مختلف درباروں میں پناہ لیتا ہوا رَے پہنچا اور علاء الدولہ محمد کا وزیر مقرر ہوا۔ بو علی سینا عالمگیر شہرت اور لیاقت کا حکیم تھا۔ اُس نے بے شمار کتابیں طب، فلسفہ، ہیئت، نجوم، ہندسہ، منطق اور اخلاق پر لکھی ہیں

ان میں سے شفا اور قانون بہت مشہور ہیں۔

البیرونی، خمار اور عراق غزنی پہنچے اور سلطان محمود کے خوانِ کرم سے فیضاب ہوتے رہے۔

سلطان محمود نے دُور دراز ممالک سے فضلاء اور علماء کو بڑی سعی اور کوشش سے بلایا۔ بے انتہا قدر کی۔ زر و جواہر خلعت اور بیش بہا انعامات سے مالا مال کیا۔ پروفیسر براؤن اپنی کوتاہ بینی سے سلطان کی اس کوشش اور علم پروری کی داد نہ دے سکے اور طنزیہ لکھتے ہیں کہ "سلطان محمود کا تذکرہ اکثر ایک علم پرور سلطان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں اُس نے علماء کو مختلف درباروں سے اغوا کیا۔ اور آخر میں فردوسی کی طرح ذلیل کیا۔" اس کے بعد پروفیسر صاحب نے اس خط کا تذکرہ کیا ہے جو سلطان نے ابو علی ابن سینا وغیرہ کی طلبی کے لئے مامون خوارزم شاہی کو لکھا تھا۔

پروفیسر صاحب کی پیرمائے حقیقت سے کس قدر دور ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شہزادہ مسعود کی آمد پر دربار میں جو قصائد پڑھے گئے۔ اُن کے صلہ میں ہر شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے گئے تھے۔ صاحب شعر العجم کا بیان ہے کہ محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو دولت و مال سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ چار سو زرّیں کمر غلام رکاب میں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اور جب سفر کرتا تو

اس کا ساز و سامان جو عموماً طلائی اور نقرئی ہوتا تھا۔ چار سو اونٹوں پہ بار کیا جاتا تھا۔ انتہا یہ تھی کہ دیگیں بھی طلائی اور نقرئی ہوتی تھیں۔ یہ بارش کرم کسی ایک موقعہ یا کسی ایک شاعر تک محدود نہ تھی۔ فرخی کی دولت وجاہ کا یہ حال تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو بیس زرین کمر غلام رکاب میں چلتے تھے۔ ایک بار عنصری کو دو شعروں پر دو توڑے انعام دئے۔

صرف یہی نہیں بلکہ محمود کے خوان کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے۔ اور ان میں سے کسی ایک نے بھی فکر معاش کے لئے کسی دوسرے دربار میں جانے کی تمنا نہیں کی یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ایران میں شیعوں کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لیکن محمود نے علم و ادب کے معاملہ میں کبھی مذہبی تعصب یا تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ اس کے دربار میں متعدد شیعہ علما رہتے۔ اور ابو ریحان البیرونی کو جو اعلانیہ شیعہ تھا۔ دربار میں بہت بلند رتبہ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندو، عیسائی اور یہودی علماء اس چشمۂ کرم سے سیراب تھے۔

محمود خود صاحب علم و فضل تھا۔ جواہر مضیہ (سوانح فقہائے حنفیہ) میں اس کو فقہا کی صف اول میں شمار کیا گیا ہے۔ خود اس نے فقہ کی ایک کتاب تصنیف کی۔

دارالسلطنت میں اس نے ایک عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا تھا۔ جس میں نوادر کا ایک بیش بہا مجموعہ موجود تھا۔ شاعری کا اس نے ایک مستقل محکمہ قائم کیا۔ اور ملک الشعرا عنصری اس کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔

فارسی شاعری کا احیار (۷) رودکی (۸) اور دقیقی کے ہاتھوں ہوا اور غزنوی دور کے شعرا نے اس کو بام ترقی کی آخری منازل تک پہنچا دیا۔ دور غزنویہ کے مشہور شعرا مندرجہ ذیل تھے:-

(۹) عنصری ملک الشعراء، افسر محکمہ شاعری، (۱۰) عسجدی (۱۱) فرخی مصنف ترجمانِ بلاغت (۱۲) صاحب شاہ نامہ فردوسی (۱۳) اسدی جس نے مناظرہ کی نظمیں لکھیں۔ ان کے علاوہ (۱۴) ابوالفرج (۱۵) منوچہری (۱۶) زینتی (۱۷) بندار رازی، وغیرہ۔ (۱۸) سلطان ابوسعید ابوالخیر نے (۱۰۴۹ ——— ۹۶۷) فارسی شاعری میں تصوف کو داخل کیا۔ اور رباعیات میں تصوف اور اخلاق کے مسائل بیان کئے۔

دورِ غزنویہ میں فارسی زبان اور شاعری نے بیحد ترقی کی اور ہر صنف کی شاعری پر نہ صرف طبع آزمائی کی گئی بلکہ اس کو جلا دے کر جوہرِ بے بہا بنا دیا گیا۔ خصوصاً رزمیہ شاعری میں فردوسی کا شاہ نامہ حرفِ آخر ہے جو ہر اعتبار سے نہایت مکمل اور بلند پایہ تصنیف ہے۔ شاہ نامہ میں صرف ناموران ایران کے افسانے ہی شاعرانہ زورِ بیان کے ساتھ نہیں بیان کئے گئے ہیں بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اس سے ہم کو ہر عہد کے رسم و رواج، رہنے سہنے کے طریقے، لباس، اور سامانِ آرائش کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ کا طالب علم اس رزمیہ نظم سے ایرانِ قدیم کے متعلق بہت قیمتی مواد فراہم کر سکتا ہے۔

اس دور میں قصیدہ نے بھی بہت ترقی کر لی تھی۔ عنصری کے قصائد میں اعلیٰ مضامین، صحیح جذبات، پُر زور مدح۔ ہر چیز بہت بلند مرتبہ کی موجود ہے۔ اور اس کے علاوہ تشبیب کا جو زور اس کے یہاں ہے۔ وہ بعد کے شعرا میں بھی کم نظر آتا ہے۔ پھر اس عہد میں قصیدہ "کارِ ہوس پیشگان" نہ تھا بلکہ آپ کو عنصری اور منوچہری وغیرہ کے قصائد میں واقعہ نگاری اور قدرتی مناظر کی بولتی ہوئی تصویریں بھی ملیں گی۔ اگرچہ صنائع و بدائع کا استعمال اس عہد سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مگر عنصری و فرخی وغیرہ نے ان کو پوری احتیاط کے ساتھ اس طرح استعمال کیا ہے کہ گویا نگینے جڑ دئے ہیں۔ اسدی طوسی اور فرخی سے نے صنایع و بدایع پر دو کتابیں بھی تصنیف کیں۔

عہد غزنویہ سے قبل جو مرثیے لکھے گئے وہ کسی طرح بھی مرثیہ کہلانے کے مستحق نہیں۔ لیکن فرخی کے مرثیہ میں جو اس نے سلطان محمود کی وفات پر لکھا ہے۔ مرثیہ کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ سلطان کی عظمت، شان و شوکت اور ذاتی محاسن کا ذکر جس درد انگیز طریقہ سے کیا ہے' اس کی وفات سے ملک پر جو اثر ہوا اس کو جس خوبی سے بیان کیا ہے اور پھر آخر میں سلطان کو مخاطب کر کے اپنے جذبات کا اظہار جس قدر رقت انگیز طریقہ سے کیا ہے وہ اس کے مرثیہ کو بہت بلند کر دیتا ہے۔

اس زمانہ میں زبان کی ترقی کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ چنانچہ اسدی طوسی نے فارسی کا ایک مبسوط لغت تیار کیا۔ شعراء نے زبان میں صفائی سلاست اور شیرینی پیدا کی۔ اس زمانہ کے ادبی ذخیرہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام انداز یہ تھا کہ خیالات میں صفائی اور سادگی، اور طرز ادا میں برجستگی اور اعتماد پایا جاتا ہے۔ خیالات کی ندرت اور بلند پردازی بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس دور کی جتنی تصنیفات ہیں خواہ وہ نثر کی ہوں یا نظم کی اپنے مضامین کے اعتبار سے ایک خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔

دورِ غزنویہ کے شعراء نے عربی کے مشہور شعراء متنبی، حریری ہمدانی اور ابو تمام کا اثر قبول کیا ہے۔ جو اُن کے کلام میں جا بجا نمایاں نظر آتا ہے۔ بے شمار عربی کے الفاظ اور فقرے فارسی میں داخل ہو گئے۔ اسلاف کے کارنامے، ماضی کی رنگین داستانیں اور قومی جذبات بڑے جوش و خروش سے بیان کئے گئے۔ یہاں تک کہ فردوسی باوجود مسلمان ہونے کے جب سرزمین ایران پر عربوں کے تسلط ہونے کا ذکر کرتا ہے تو ایرانی النسل ہونے کے باعث قومی جذبات سے مغلوب ہو کر بے اختیار چلا اٹھتا ہے۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

(۴)

ابتدائی دورِ سلجوقیہ

(۱۰۴۴ء ——— ۱۰۹۲)

سلجوق بن تقاق ترکمانی خاندان سلجوقیہ کا بانی تھا۔ سلجوقی اقتدار سے قبل ایران میں متعدد خاندان حکومت کرتے تھے۔ جن میں سے غزنویہ اور آلِ بویہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۰۳۵ء میں جب کہ مسعود بن سلطان محمود طبرستان میں دارا ابن منوچہر کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ طغرل بیگ نے مرو اور نیشاپور پر قبضہ کر کے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ اور اب غزنوی حکمرانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تاکہ ایران کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ تین سال تک مسلسل جنگ جاری رہی اور ۱۰۴۰ء میں سلطان مسعود قتل کر دیا گیا۔ خاندان غزنویہ کا رہا سہا اقتدار باہمی بغض و عناد اور خانہ جنگیوں سے تقریباً ختم ہو چکا تھا کہ سلجوقیوں سے مسلسل جنگ نے اُن کی ہمتوں کو اور بھی پست کر دیا۔ اس کے بعد سلطان محمدؒ اور سلطان مودود یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ لیکن کسی ایک کو بھی سلجوقیوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور بالآخر طغرل بیگ نے خراسان کے مقام پر ۱۰۴۴ء میں مودود کو آخری شکست دی اور خاندان غزنویہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

خاندان غزنویہ ترکوں کے فاتحانہ حملوں سے قبل ہی زوال پذیر ہو چکا تھا۔ اور ۱۰۵۵ء میں طغرل نے بغداد پر قبضہ کر کے اس ٹمٹماتے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا۔

گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں حکومت غزنویہ کے زوال کے ساتھ ساتھ شاعری کے بحرِ ذخار میں بھی سکون پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں یہ حقیقت واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ اس زمانہ میں علمی ترقی امراء اور سلاطین کی قدر و منزلت پر منحصر ہوتی تھی۔ علمی طبقہ کی پرورش کا دارومدار شاہِ وقت کی دریا دلی پر ہوتا تھا۔ اور اس وقت چونکہ مرکزی حکومت کو بغاوتوں کے فرو کرنے سے فرصت نہ تھی اور نوخیز حکومتوں کو پوری قوت حاصل نہ ہوئی تھی اس لئے کچھ عرصہ کے لئے علم و ادب کی سرپرستی کما حقہ نہ ہو سکی۔ لیکن نصف صدی کے ختم ہونے تک سلجوقیوں کو پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ اور علم و ادب کا آفتاب ایک بار پھر اُفقِ ایران پر پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔

اس باب میں خاندان سلجوقیہ کے صرف تین بادشاہوں کا ذکر کیا جائے گا (طغرل بیگ (۱۰۳۷-۱۰۶۳) الپ ارسلان (۱۰۶۳-۱۰۷۲) اور ملک شاہ (۱۰۷۲-۱۰۹۲) اس تقسیم کا سبب یہ ہے کہ خاندان سلجوقیہ کا یہ ابتدائی دور امن و امان، ترقی و اصلاح اور رشد و شاعری کے لئے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا شبلی نے اس عہد کے عدل و انصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عدل و انصاف، امن و امان کا یہ حال تھا کہ خراسان سے شام تک ایک رہرو تنِ تنہا سونا اُچھالتا چلا جاتا تھا۔"

یہ دور اپنی شاعرانہ خدمات کے لحاظ سے چند خصوصیات رکھتا ہے۔ اگرچہ شاعری غزنوی عہد حکومت میں معراجِ ترقی تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ صرف مضمون اور فن کے اعتبار سے تھا۔ اس طویل

زمانہ میں شعرا نے زبان کی صحت اور درستی کی طرف بہت کم توجہ کی۔ اس لئے کہ دورِ غزنویہ اور عہدِ سامانیہ میں شاعری کے مرکزدہ مقامات تھے جو ایران کے ان شہروں سے بہت دور تھے، جو زبان کے لئے مستند تسلیم کئے جاتے تھے۔ مثلاً بخارا اور غزنین ان دونوں حکومتوں کے دارالسلطنت تھے۔ اور شیراز، اصفہان اور نیشاپور فارسی زبان کے مرکز تھے۔ پھر ان مقامات کی مادری زبان ترکی یا افغانی تھی۔ دوسرے اس دورِ ترقی کے تقریباً تمام شعرا بھی ایسے مقامات کے رہنے والے تھے جو ایران کے اصلی مراکز سے دور تھے۔ مثلاً فرخی سیستانی تھا، عنصری کا وطن بلخ تھا۔ اور عسجدی اور دقیقی مرو کے رہنے والے تھے۔ وغیرہ دولت سلجوقیہ کا پایۂ تخت نیشاپور قرار پایا۔ اور اس طرح شاعری ان لوگوں نے اختیار کی جو اہلِ زبان تھے۔

اس عہد کی دوسری زبردست خدمت یہ ہے کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی دفتری زبان عربی تھی۔ اور سلطان محمود جیسے قوم پرست سلطان نے بھی اس کو تبدیل کرنا بدعت ہی خیال کیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ فارسی زبان صرف شاعری اور علمی کاموں کے لئے وقف تھی۔ الپ ارسلان سلجوقی نے سنہ ۱۰۶۳ء میں فارسی کو دفتری زبان قرار دیا۔ جس کا اثر یہ ہے کہ اس عہد میں مختلف مضامین پر بکثرت تصنیفات مل سکتی ہیں۔ تاریخ و فلسفہ، سیاحت و سیر، علم ہندسہ و نجوم، مذہب، سیاست اور قصص، غرض کوئی عنوان ایسا نہیں جس پر اس زمانہ کی متعدد تصانیف نہ مل سکیں۔

جہاں تک زبان اور طرزِ بیان کا تعلق ہے۔ عربی ادب کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ دورِ غزنوی کی سادہ اور صاف زبان کی بجائے تصنع بڑھ گیا۔ صنائع بدائع کا استعمال جا بیجا کیا جانے لگا۔ عربی استعارات اور تشبیہات

اور بعض مرتبہ تو محاورات اور ضرب الامثال تک استعمال کی جانے لگیں۔ جذبات کی سادگی اور طرز ادا کی بے ساختگی اور برجستگی۔ تصنع اور آورد میں تبدیل ہو گئی۔

اس دور کا سب سے مشہور شخص نظام الملک طوسی تھا۔ جو نہ صرف ایک اعلیٰ سیاست داں اور مدبر کی حیثیت سے ایران کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا بلکہ ترویج علوم میں جو شاندار خدمات اس نے انجام دی ہیں وہ بھی اسلامی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔ بغداد کا مشہور مدرسہ نظامیہ جس کے اساتذہ کی فہرست میں (۱) امام غزالی جیسے فقیہہ اور عالم متبحر کا نام موجود ہے۔ اسی کی فیاضی کا رہین منت تھا۔ (۲) نظام الملک خود ایک بلند مرتبہ نثر نگار تھا۔ سیاست نامہ فارسی زبان کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو زبان اور مضمون کے اعتبار سے بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں دوسرا نام عمر خیام (۱۱۲۳) کا آتا ہے۔ کس قدر عجیب ہے یہ بات کہ عمر خیام آج دنیا میں ان رباعیوں کی بدولت زندہ ہے جو یورپ کی قدر افزائی سے عالم آشکارا ہوئیں۔ حالانکہ وہ ایک زبردست فقیہہ۔ فلسفی۔ منطقی اور عالم تھا۔ اور اپنے عہد کا بہترین منجم اور مہندس بھی تھا اور ان علوم پر اس کی بلند پایہ تصانیف موجود ہیں۔ علم نجوم میں اس کی مہارت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک شاہ نے شاہی رصد گاہ کی تعمیر اس کی نگرانی میں کرائی اور مروجہ تقویم (کیلنڈر) میں عمر خیام کے مشورہ کے مطابق اصلاحات کی گئیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خیام کی رباعیات اپنے مضامین، خیالات، زبان، اور طرز ادا کے اعتبار سے اس عہد کا شاہکار ہیں۔ اس لئے اور زیادہ کہ اس نے پہلی بار فلسفیانہ نکات کے بیان کرنے کے لئے اس صنف شاعری کو پسند کیا اور اس کا صحیح استعمال کیا۔

(۳) خیام کے اہم عصر رباعی نگار شعراء ہیں (۴) سلطان ابوسعید ابوالخیر (۹۶۷-۱۰۴۹) (۵) باباطاہر عریاں (۱۰۵۸ء) (۶) اور شیخ عبداللہ انصاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ابوسعید ابوالخیر کی رباعیات اس لئے اور زیادہ قابلِ اعتنا ہیں کہ ان میں تصوف کے دقیق مضامین نہایت کامیابی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ شاعری کے جام میں ابھی تک عشق کی وہ گرمی موجود نہ تھی جس کے بغیر آج بھی شعر جسدِ بے روح سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ شعراء کی توجہ زیادہ تر دوسرے مضامین کی طرف تھی اس دور میں صرف دو ایک عشقیہ مثنویاں پائی جاتی ہیں مثلاً مثنوی وامق و عذرا، مصنفہ (۷) فصیحی گرگانی، اس کے علاوہ روشنائی نامہ اور سعادت نامہ دو کامیاب مثنویاں اور سفرنامہ (۸) ناصر خسرو (۱۰۰۴ء) کی تصانیف میں سے ہیں۔

اس عہد کی دوسری مشہور تصانیف کی تفصیل یہ ہے:-
(۹) قابوس نامہ مصنفہ کیکاؤس" (۱۰۸۲) شیخ عبداللہ انصاری نے تصوف کے مختلف عنوانات پر متعدد مفید کتابیں لکھی ہیں۔ جو طرزِ ادا کی سادگی، زبان و عبارت کی صفائی میں ایک امتیازی شان رکھتی ہیں۔ ان کی مشہور مصنفات یہ ہیں:- منازل السائرین، انوار التحقیق، نشاط نامہ، الٰہی نامہ، زاد العارفین، کتاب الاسرار، طبقات صوفیہ (۱۰) علی اسدی طوسی نے ۱۰۶۶ء میں گرشاسپ نامہ تصنیف کیا۔ اور اس کے بعد لغاتِ فارس مرتب کی۔

(۱۱) امیر قطران تبریزی نے مختلف اصنافِ سخن میں نام پایا مخمس، ذوالقافیتین وغیرہ کی ابتدا اسی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ الفاظ کی بلند آہنگی، مشکل تراکیب بعید از قیاس تشبیہات اور استعارات کے استعمال اور پیچیدہ طرزِ ادا نے اس کی شاعری کو اور جاذبِ نظر بنا دیا۔ امیر قطران مثالیہ شاعری

کا استاد تھا اور اُس کے اِسی کمال لے باوجود اس کی بے اعتدالیوں کے تہمت کے دامن کو داغدار نہیں ہونے دیا۔

تصوّف کے میدان میں دو اہم تصانیف اور قابل ذکر ہیں۔ (۱۲) ایک داتا گنج بخش علی بن عثمان ہجویری کی کشف المحجوب دوسرے عہد اسلام کے سرمایہ ناز فاضل علوم الٰہیات حضرت امام غزالیؒ کی اسلامی اصول اور عقائد پر سیر حاصل کتاب کیمیائے سعادت۔

بیان الادیان مصنفہ (۱۳) ابو المعالی محمدؒ عبید اللہ (۱۰۹۲ء) اگرچہ ایک مذہبی تصنیف کی حیثیت سے متذکرہ بالا کتابوں کی ہم پلہ نہیں لیکن جہاں تک زبان، طرز ادا اور بلاغت کا تعلق ہے اس دور کی ایک اہم تصنیف ہے۔

---

(۵)

آخر دورِ سلجوقیہ

(۱۰۹۲ء ——— ۱۱۵۷)

فارسی تاریخ ادب کا یہ دور حقیقت میں ملک سنجر کی علمی سرپرستی اور فنون پروری کی ایک دلچسپ داستان ہے۔ سلطان محمود کے انتقال کے بعد چمنستان ادب میں ایک بار پھر بہار آئی اور پورے جوش کے ساتھ آئی۔ علم پرور بادشاہ کی قدر افزائی اور فیاضی کی وہ فراوانی ہوئی کہ ہوس پرست شعراء کے دامن بھی تنگ نظر آنے لگے۔ درباری شاعر کا عہدہ جو ایک مدت سے ختم ہو چکا تھا پھر زندہ ہوا۔ اور امیر معزی

کے سر پر ملک الشعرائی کا تاج رکھا گیا۔ ہر چہار طرف سے فضلا، اور شعرا، وابستگان دولت میں شامل ہونے شروع ہوئے۔ خاندانِ سلجوقیہ کے اس بلند ہمت، بلند نظر، بلند حوصلہ بادشاہ نے تقریباً ۶۵ سال حکومت کی۔

سلطان سنجر کی حاتمانہ فیاضیوں کی قدر اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے عہد حکومت کا زیادہ حصہ خاندانی مناقشات، اندرونی سازشوں، بغاوتوں اور بیرونی حملوں کے سدباب میں صرف ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے دربار فیض آثار نے (۱) امیر معزی (۲) اھسنی (۳) نظامی عروضی (۴) انوری اور (۵) خاقانی جیسے بے مثل اور عالی مرتبت شعراء اور مصنف پیدا کئے۔ جنہوں نے فارسی شاعری کے خزانہ میں نہ صرف متعدد اصناف سخن کا اضافہ کیا بلکہ اس کے معیار کو بہت بلند کر دیا۔

اس زمانہ میں ایران میں تین خاندان اور حکمراں تھے، سلاطین غور، شاہانِ غزنی، اور شاہزادگانِ خوارزم شاہی یہ تینوں سلطنتیں چونکہ سلطان سنجر سے رقابت کے تعلقات رکھتی تھیں۔ اس لئے باوجود اپنی بے مایگی اور فقدانِ سکون کے سخن پروری پر مجبور رہتیں۔ ذیل میں ہم مختصر طور پر ان کا تذکرہ کریں گے۔

خاندان غزنویہ اس دور کے آغاز میں سلطان ابراہیم غزنی پر حکومت کرتا تھا۔ ۱۰۹۹ء میں اس کے انتقال کے بعد چھوٹے لڑکے بہرام شاہ نے اپنے دو بھائیوں کو قتل کر کے ۱۱۱۸ء میں تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور ۳۴ سال حکومت کر کے ۱۱۵۲ء میں رحلت کر گیا

(۶) مسعود بن سعد سلمان ابراہیم شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔

بہرام شاہ کی علم دوستی کا تذکرہ فرشتہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"با علماء و فضلاء بسیار نشستے و صحبت ایشان دوست داشتے و ہر کہ را بقدر علمش رعایت کردے ابتدا۔ فضلاء آں روزگار باسم شریفش کتب ساختہ اند و تصنیفات پرداختہ اند۔"

بہرام شاہ کے حکم سے "کلیلہ دمنہ" کا ترجمہ عربی نسخہ سے فارسی زبان میں (۷) نصر اللہ بن حامد نے ۵۴۵ھ میں کیا۔

اس سے قبل فارسی شاعری میں تصوّف کا عنصر خیام اور ابو سعید ابوالخیر کی رباعیات کی صورت میں تھا اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان دونوں کاملین فن نے مسائل تصوّف کی وضاحت یا شرح و بسط کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ بلکہ ہر جگہ جوشِ عشق ہی نمایاں ہے۔ اس دور میں (۸) حکیم سنائی نے حدیقہ میں تصوّف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوانات کے تحت نہایت وضاحت اور خوبی سے بیان کر کے تصوّف میں بیش بہا اضافہ کیا۔

اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم موصوف ہی نے قائم کی اور شعرائے متوسطین و متاخرین انہیں کے قائم کردہ اصولوں کے کاربند نظر آتے ہیں۔ آن کی دوسری تصانیف یہ تھیں۔ طریقۃ التحقیق، غریب نامہ، کارنامہ، عشق نامہ، عقل نامہ اور ایک مکمل دیوان جس میں ہر صنف سخن پر اشعار موجود ہیں۔

خاندان غوری

۵۴۳ھ میں بہرام شاہ نے اپنے داماد قطب الدین محمد جبلی کو قتل کرا دیا۔ چونکہ مرحوم غوری خاندان کا ایک مقتدر شاہزادہ تھا اس لئے اس کے دونوں بھائی علاء الدین حسین اور سیف الدین سوری، بہرام شاہ کی اس بربریت پر بے حد برہم ہوئے اور انتقام کی ٹھانی۔ سیف الدین غزنی کا گورنر تھا۔ اس نے بہرام شاہ

کو وہاں سے نکال دیا۔ لیکن جلد ہی ایک سازش کے ماتحت سیف الدین گرفتار ہوا، تمام شہر میں منہ کالا کر کے رسوا کیا گیا۔ اور اس کے بعد نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ سیف الدین کا قتل بغیر رنگ لائے نہ رہا۔ چنانچہ بہرام شاہ کے انتقال کے تین سال بعد علاء الدین حسین نے شہر غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور اس درجہ مظالم کئے کہ جہاں سوز کا لقب پایا۔

لیکن علاء الدین کی ادب نوازی اور ذوقِ شعری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ غیظ و غضب اور انتقام کی اس دیوانگی میں اگرچہ اس نے سلطان محمود، مسعود اور ابراہیم کی تمام یادگاروں کو برباد کیا لیکن ان اشعار کو جو اُن کی تعریف میں لکھے گئے تھے سونے کے عوض خریدا اور نہایت احتیاط سے اپنے کتب خانہ میں محفوظ کیا۔ (بحوالہ چہار مقالہ) اسے خود شاعری سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اگرچہ اس کے خوف سے شہر میں سلاطینِ غزنوی کا نام تک لینا جرم تھا۔ لیکن وہ خود شاہنامہ کے وہ اشعار جن میں اُن کی مدح تھی۔ نہایت ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ اس خاندان کی سرپرستی میں فارسی شعراء کا سب سے زیادہ مقتدر اور قابلِ اعتبار تذکرہ چہار مقالہ مصنفہ (۹) نظامی عروضی مرتب کیا گیا۔ جو نہ صرف فارسی نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ بلکہ نظامی عروضی نے اپنی اس تصنیف کے ذریعہ سے فارسی نثر نگاری کا اسلوب ہی بدل دیا۔

شاہانِ خوارزم شاہی خاندان خوارزم شاہی کا مورث اعلیٰ نوشتگین تھا۔ جو ملک شاہ سلجوقی کے دربار میں ساقی کی خدمت پر مامور تھا۔ شاہ نے اس کی اعلیٰ خدمات کے صلہ میں خوارزم کی جاگیر اس کو عطا

فرمائی۔ اور اس طرح ۱۰۷۷ء میں اس خاندان کی بنیاد رکھی گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حکمرانوں کے تدبر اور لیاقت کی وجہ سے یہ سلطنت آزاد ہو گئی اور سلطنت سلجوقیہ سے چشمک زنی پر آمادہ نظر آنے لگی۔ شاہزادگانِ خوارزم شاہی کی شہرت کا آغاز سلطان اتسز کی تخت نشینی سے ہوتا ہے۔ ابھی یہ لائق حکمران ۱۱ سال ہی حکومت کر سکا تھا کہ ۱۱۳۸ء میں سلطان سنجر نے اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر خوارزم پر حملہ کیا اور بری طرح شکست دی۔ لیکن سلطان اتسز نے دامن اُمید ہاتھ سے نہ دیا۔ اور جلد ہی اپنی طاقت کو مجتمع کر کے خوارزم پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کی آتش انتقام سرد نہ ہوئی اور ۱۱۴۱ء میں سلطان سنجر کے دوسرے مخالفین کے ساتھ مل کر اس کو شکستِ فاش دی اور مرو اور نیشاپور پر بھی قبضہ کر لیا ساطنت سلجوقیہ کمزور ہو رہی تھی یا خوارزم شاہیوں کی طاقت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ سلطان سنجر باوجود سخت کوشش کے سلطان اتسز کو دوبارہ شکست نہ دے سکا۔ اور مجبوراً صلح کرنی پڑی۔

خوارزم شاہی دربار علمی سرپرستی کے لئے فارسی ادب کی تاریخ میں ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔ سلطان اتسز نہ صرف ایک سخن فہم بادشاہ تھا بلکہ شعراء و فضلاء کی بے انتہا دل جوئی کرتا۔ (۱۰) رشید وطواط اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ رشید کے بلند آہنگ قصیدے جو صنائع بدائع کے زیور سے آراستہ تھے۔ فارسی شاعری کا ایک اہم جزو ہیں۔

رشید صرف شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا نثر نگار بھی تھا۔ اس کی دو تصانیف صد کلمہ جس میں خلفائے راشدینؓ کے ارشادات درج ہیں۔ اور حدائق السحر جو بلاغت پر ایک محققانہ تصنیف ہے۔ بہت

مشہور رہیں۔ خاقانی حقیقت میں منوچہر شراون شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ لیکن کبھی اپنے ممدوح کی نازک مزاجی کی وجہ سے مطمئن نہ رہا۔ اور اسی واسطے دوسرے درباروں سے بھی تعلقات رکھتا تھا۔ چنانچہ رشید وطواط کی شان میں اُس نے اشعار لکھے ہیں اور ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس خاندان کا رہین منت رہا ہے۔ (۱۱) ادیب صابر بھی سلطان اتسز کے دامن دولت سے وابستہ تھا۔ ذخیرۂ خوارزم شاہی مصنفہ (۱۲) ابو ابراہیم جو علم طب پر ایک مبسوط تصنیف ہے۔ اسی خاندان کی سرپرستی کا فیض ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ دور باہمی مناقشات، اور خون ریز لڑائیوں کے تذکرہ سے رنگین ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ متعدد خاندانوں کی رقیبانہ علمی سرپرستی کی بدولت فارسی ادب نے جو ترقی حاصل کی وہ بے نظیر ہے۔

صوفیانہ شاعری کی بنیاد اسی عہد میں حکیم سنائی کے ہاتھوں مستحکم ہوئی اور اُس کی افادیت میں اضافہ ہوا۔

قصائد کو اگرچہ کوئی خاص ترقی نصیب نہیں ہوئی اور خوشامد اور مبالغہ میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ لیکن خاقانی کے نعتیہ قصائد قطع نظر لفظی صنائع اور مصطلحات علمیہ کے معنوی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ الفاظ کی نشست، صنائع کا استعمال اور علمی اصطلاحات کی کھپت جو آپ کو اس عہد کے قصائد میں ملے گی اس کی دوسری جگہ مثال ملنا دشوار ہے (۱۳) عبدالواسع جبلی اور رشید وطواط کے اکثر قصائد ایسے ملیں گے جو صنعت طباق سے مرصع ہیں۔ بعض قصائد میں اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ کوئی ایک مخصوص حرف کہیں نہ آنے پائے۔ پھر کمال یہ ہے کہ اس لفظی بازیگری کے باوجود برجستگی اور روانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انوری نے اپنے بعض قصائد میں امور سیاست اور معاشرت

کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔
(۱۴) ابوطاہر فارسی شعرار کا سب سے پہلا تذکرہ نویس اسی عہد کی یادگار ہے۔ شاعری کے اس رنگین فردوس چمن میں ہجو کے خار بھی موجود ہیں۔ جن کی آبیاری (۱۵) سوزنی اور رالوزی کے دماغوں سے ہوئی۔

(۶)

ماقبل دورِ منگولیہ

(۱۱۵۷ ——— ۱۲۲۰ع)

یہ دور حقیقت میں آخر دورِ سلجوقیہ اور منگولیہ کے درمیان ایک ایسا زمانہ ہے۔ جب کہ ایران میں کوئی بااثر حکومت ۶۵ سال کی طویل مدت تک نہ ہوئی ہر چہار طرف چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم تھیں جو نہ صرف ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتیں بلکہ بیرونی حملوں کے خوف سے سکون و امن کی اس نعمت سے جس کی دورِ سلجوقیہ میں فراوانی تھی یکسر محروم تھیں۔ شاہ سنجر کی وفات (۱۱۵۷) سے منگول حملے (۱۲۲۰) تک ایران میں متعدد خاندان پیدا ہوئے اور ملک میں مرکزی سلطنت نہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد ترقی کر گئے۔ لیکن منگولی حملوں کا سیلاب سب کو بہا کر لے گیا۔ یہاں اس حقیقت کو بھی ظاہر کردینا ضروری ہے کہ یہ تمام حکومتیں اپنی قوت اور شوکت کے لئے شاہانِ سلجوقیہ کی ہمت افزائی اور پشت پناہی کی رہینِ منت رہی تھیں۔

شاہانِ خوارزم شاہی اس حکومت کی ہنرپروری اور علمی سرپرستی کا

تذکرہ گذشتہ باب میں تفصیل سے کیا جا چکا یہاں اس کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ گذشتہ سلطنتوں کی یادگار صرف یہی باقی تھی، جن میں سلجوقی جاہ وحشم کی جھلک نظر آتی تھی۔ ۱۱۵۶ء میں سلطان اتسز نے وفات پائی اس کے بعد ارسلان، سلطان شاہ محمود اور علاء الدین محمد یکے بعد دیگرے سریر آرائے حکومت ہوئے۔

جلال الدین کے عہد میں منگولوں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس نے نہایت دلیری اور جوانمردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ اس نے منگولوں کو شکست دے کر کرمان، فارس رے اور اصفہان کو تسخیر کر لیا تھا اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ ایک بار پھر خوارزم شاہی پرچم ایران پر لہرائے گا۔ لیکن اس کی تھکی ہوئی فوج منگولوں کی تر و تازہ کمک کا مقابلہ نہ کر سکی اور بالآخر اسے شکست ہوئی۔ ۱۲۳۱ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور اس طرح سلطنت خوارزم شاہی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

اتابک اسی زمانہ میں اتابک بھی ایران میں حکومت کرتے تھے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ایک ترکی جرنل تھا۔ جو بعد میں طغرل بیگ کا حاجب مقرر ہو گیا تھا۔ اس خاندان کا سب سے پہلا خودمختار حکمران سونکر بن مودود تھا۔ جو فارس کی حکومت پر ۱۱۴۸ء میں قابض ہوا۔ چوتھا حکمران سعد بن زنگی تھا۔ جو شاہان خوارزم شاہ کا باجگزار تھا۔ اس کے بعد

ابوبکر بن سعد بن زنگی تخت نشین ہوا۔ اور اس نے منگول شہنشاہ اغوتائی خاں کی اطاعت قبول کر لی۔ اور اس کے بعد تمام حکمران اسی خاندان کے مطیع رہے اتابک خاندان کی آخری تاجدار شاہزادی آبش خاتون تھی۔ جس نے ہلاکو کے لڑکے سے شادی کر لی تھی اور اس طرح اس کی وفات کے بعد ۱۲۸۷ء میں

یہ سلطنت بھی منگولوں کے قبضہ میں آگئی۔

فارسی غزل کے امام اور گلستاں کی سہل ممتنع نثر کے موجد حضرت سعدی علیہ الرحمۃ باوجود اپنی آزادروی اور جاہ و حشمت دنیوی سے بے نیازی کے اسی خاندان کے متوسلین میں ہیں۔

اس دور کی خصوصیات کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آخر دور سلجوقیہ کے انداز میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ امن و سکون، قدرشناسی، اور ہمت افزائی کے فقدان کی وجہ سے ایک خاص ذہنی انقلاب کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ منگولوں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ درباروں کی جاہ و حشمت حساس شاعر کی آنکھ اپنے سامنے مٹتے دیکھ رہی تھی۔ اس لئے رنگِ شاعری میں تصوف کا غلبہ نظر آنے لگا۔ دوسری قابل ذکر بات غزل کی ابتدا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگی جذبات کی پژمردگی کے ساتھ ساتھ طبیعت میں انفعالی اثر پیدا ہونے لگا تھا۔ اور اس کے اظہار کے لئے غزل سے بہتر دوسری صنف نہ تھی۔ دنیا کی بے ثباتی اور قناعت کے مضامین غزلوں میں بیان کئے جانے لگے۔ قصیدہ میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اس صنف کی ترقی کا میدان مسدود ہو چلا تھا۔ اس دور کے مشہور شعراء اور مصنفین۔ (۱) نظامی گنجوی، (۲) ظہیر فاریابی، (۳) خواجہ فرید الدین عطار (۴) اور شیخ سعدی تھے۔

نظامی گنجوی (۱۲۰۲-۱۱۴۰) نے پانچ مثنویاں موسومہ خمسہ لکھیں۔ مخزن الاسرار (۱۱۶۶) خسرو شیریں (۱۱۷۶) لیلیٰ مجنوں (۱۱۸۹) سکندر نامہ (۱۱۹۱) اور ہفت پیکر (۱۱۹۹) یہ مثنویاں اس قدر مقبول ہوئیں کہ اس کے بعد متعدد شعراء نے اس کی تقلید کی۔ نظامی نے چند قصائد اور تھوڑی سی غزلیں بھی لکھیں لیکن فارسی ادب میں اُن کے قصائد و غزلیات کو کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں۔

ظہیر فاریابی :- (۱۲۰۱ — ۱۱۵۶) اس دور کا بہترین قصیدہ گو۔ اگرچہ انوری اور خاقانی کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو سلاست اور روانی ظہیر کے قصائد میں پائی جاتی ہے۔ وہ قابلِ تحسین ہے۔

خواجہ فرید الدین عطار - (۱۲۲۹ — ۱۱۲۰) فارسی میں صوفیانہ شاعری کے تین امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ سنائی، عطار اور رومی، ان اصحاب ثلاثہ میں عطار ایک خاص مرتبہ کے مالک ہیں۔ اور تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے سب سے بہتر آپ کی چند تصانیف کے نام یہ ہیں۔ پند نامہ۔ منطق الطیر۔ تذکرۃ الاولیا۔ خسرو نامہ اسرار نامہ۔ مصیبت نامہ۔ الٰہی نامہ۔ مظہر العجائب اور لسان الغیب۔

شیخ سعدی (۱۲۹۱ — ۱۱۸۴) فارسی میں گلستان سے بہتر نثر کی دوسری کوئی کتاب زبان اور مضمون کے اعتبار سے موجود نہیں۔ بلند اخلاقی مضامین کو آسان زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ایک بچہ بھی نفسِ مضمون کی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح غزل کی ایجاد کا سہرا بھی شیخ ہی کے سر ہے۔

(۵) ابو نصر فرخی (۱۲۴۲) نے فارسی۔ عربی الفاظ کی ایک ضخیم لغات نظم میں مرتب کی۔

(۶) محمد بن الحسن بن اسفندیار نے (۱۲۱۷ — ۱۸) تاریخ طبرستان مرتب کی۔

---

(۷)

دورِ منگولیہ

(۱۲۲۰ء — ۱۳۳۵ء)

منگولوں کا سردار چنگیز خاں تاتاری تھا۔ شروع میں اس نے چند تاجر اپنے ملک کی مصنوعات لے کر سلطنتِ خوارزم کو روانہ کئے۔ لیکن وہاں کے گورنر نے ان تاجروں کو بے گناہ قتل کر ڈالا۔ یہ خبر سُن کر چنگیز خاں نے بغرا خاں کی سرکردگی میں ایک وفد روانہ کیا۔ جس نے خوارزم کے گورنر کے سامنے دو شرائط پیش کیں۔ یا تو قاتلین کو فوراً اس وفد کے حوالہ کر دیں یا منگولی انتقام کے لئے تیار ہو جائیں۔ خوارزم کے نادان گورنر نے بغیر انجام کار سوچے ہوئے بغرا خاں کو قتل کرا دیا۔ اور وفد کے دوسرے آدمیوں کی داڑھیاں مونڈ کر واپس کر دیا۔ اس خبر سے منگولوں کی آتشِ غضب بھڑک اٹھی فوراً قرلتائی (مجلس شورائے ملی) کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اس مجلس نے منگولوں کی اس توہین کا جواب دینے کے لئے مملکت ایران پر حملہ کا فیصلہ کیا۔

۱۲۱۹ء میں چنگیز خاں نے پوری بربریت کے ساتھ ایران پر حملہ کیا اور دیوانہ وار تمام ملک کو تہ و بالا کر ڈالا۔ جوشِ انتقام نے ان وحشی منگولوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اور ان کی نگاہیں امتیاز نیک و بد سے قاصر تھیں۔ بخارا، نیشاپور، سمرقند، ترمذ اور مرو وغیرہ

میں خون کی ندیاں بہادیں، شہر ویران کر دئیے ۔ مساجد، مقابر مدارس اور مکاتب مسمار کر دئیے ۔ کتب خانوں میں آگ لگا دی۔ غرض چنگیزی حملہ ایک سیلاب بلا تھا۔ جو اپنے ساتھ ہر اس شے کو بہا کر لے گیا۔ جو راہ میں ملی۔ کم سے کم چالیس لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔

۱۲۲۷ء میں چنگیز خاں کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اغوتائی خاں (۱۲۲۷ - ۱۲۴۱) کیوک (۱۲۴۱ - ۱۲۴۸) اور منگو خاں (۱۲۴۸ - ۱۲۵۷) یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔

۱۲۵۱ء میں منگو خاں کے عہد حکومت میں قرلتائی (مجلس شوریٰ ملی) نے یہ طے کیا کہ دو جماعتیں ملک گیری کے لئے روانہ کی جائیں۔ ایک قبلا خاں کی سرکردگی میں چین کی فتح کے لئے اور دوسرے ہلاکو خاں کی ماتحتی میں خلافت بغداد اور اسماعیلیوں کے خاتمہ کے لئے۔ قبلا خاں کو تسخیر چین میں عظیم الشان کامیابی ہوئی اور جلد ہی وہاں مستحکم منگولی حکومت قائم ہو گئی۔

ہلاکو خاں مغربی ایشیا کو تخت و تاراج کرنے ۱۲۵۲ء میں روانہ ہوا۔ اس کی جمعیت ایک طوفان کی طرح وسط ایشیا سے اٹھی اور آن کی آن میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ سینکڑوں شہر برباد کر دئیے۔ خاندان کے خاندان نہایت بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کئے۔ خلافت عباسیہ کا نام ونشان مٹا دیا۔ تحریک اسماعیلیہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔ غرض تباہی و بربادی کا وہ منظر پیش کیا۔ جو اپنی بربریت و وحشت کے لئے ضرب المثل ہو کر رہ گیا۔ ہلاکو خاں اور اس کے جانشیں برائے نام شہنشاہ چین کے ماتحت تھے اور اسلام

لانے سے قبل ہی یہ لوگ آزاد ہو گئے تھے۔ ۱۲۵۵ء میں ہلاکو خاں نے (۱) ابن عطا ملک جوینی صاحب تاریخ جہاں کشا کو اپنا معتمد خاص مقرر کیا۔ ان تمام مہموں میں وہ اس کے ساتھ تھا (۲) خواجہ نصیر الدین طوسی مصنف اخلاق ناصری بھی ایک عرصہ اس کا ملازم

اور ہمرکاب رہا۔ ہلاکو خاں اور اس کے ورثار ایلخانی کہلاتے تھے اور عرصہ تک قبلائی خاں کی سلطنت کے ماتحت رہے۔ ۱۲۶۵ء میں ہلاکو خاں کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اباقا خاں مالک تخت و تاج ہوا اور ۱۲۸۲ء تک پورے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی اس کی وفات کے بعد احمد تکودار خاں وارث ہوا۔ یہ پہلا ایلخانی تھا جو مشرف با سلام ہوا۔ اور علمار عصر کی بہت عزت کی۔ لیکن منگول قوم کب اس تبدیل مذہب گوارا کر سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۲۸۴ء میں ایک زبردست سازش کے ماتحت قتل کر دیا گیا۔ اور

ارغون خاں بن اباقا خاں کو تخت نشین کیا گیا۔ جس نے ۱۲۹۱ء تک حکومت کی۔ اگرچہ ارغون لامذہب تھا لیکن اسلام سے اس کو بیر تھا۔ سعد الدولہ نامی ایک یہودی اس کا وزیر تھا جس نے مقتدر علمار اسلام کو قتل کیا۔ اور شعائر اسلام کو بالکل مٹا دیا۔ اور مسلمانوں کے لئے عرصۂ زندگی تنگ کر دیا۔ اس کے بعد گیخاتو تخت نشین ہوا۔ اس کی خاص یادگار لفظ "چاؤ" ہے۔ جو اس نے کاغذی سکہ کا نام رکھا تھا۔ ۱۲۹۵ء میں اس کے چچا زاد بھائی بائڈو نے تاج و تخت سنبھالا لیکن ۶ ماہ کے بعد قتل کر دیا گیا۔

وحشی اور جنگجو منگولوں کے خاندان میں غازان خاں ہی ایک ایسا بادشاہ گزرا ہے جس نے نہ صرف علی الاعلان اسلام قبول کیا

اور اس کے ساتھ تقریباً ۱۰ ہزار تاتاری حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بلکہ ایران میں تقریباً پون صدی کے بعد ایک بار پھر امن و سکون کا دور دورہ ہوا۔ عوام کے دلوں میں منگولوں کی جو ہیبت بیٹھ گئی تھی وہ بھی رفع ہوئی۔ علم و فن کے وہ بیش بہا جواہر جو تاتاری آشوب کی بدولت خاک آلود پڑے تھے۔ چمک اٹھے۔ غازان خاں خود عربی، فارسی، چینی، لاطینی زبانوں سے واقف تھا۔ علماء اور فضلاء کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے عہد میں (۳) عبداللہ وصاف حضرت صاحب تاریخ وصاف اور (۴) رشید الدین فضل اللہ مصنف جامع التواریخ جیسے مورخین و مصنفین پیدا ہوئے۔ مساجد و مقابر جو اب تک تباہی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے اس کی توجہ سے درست ہوئے۔ جا بجا ترویج علوم کے لئے مدرسے قائم کئے گئے۔ یہ شاہ علم پرور دس سال کی حکومت کے بعد ۱۳۰۴ء میں راہی ملک بقا ہوا۔ اس کے بعد الجائتو خاں خدابندہ اور سلطان ابوسعید خاں یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ ابوسعید خاں کی سلطنت کا زمانہ مختلف لڑائیوں اور خانہ جنگیوں میں صرف ہوا۔ اور ۱۳۳۵ء میں اس کے انتقال کے بعد ایلخانیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس دور کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ تاتاری حملے کے بعد ایران کا زمین و آسمان بدل گیا تھا۔ ایرانی زندگی کے ہر پہلو پر اس کا ایک گہرا اثر پڑا تھا۔ سلطنتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ عیش و عشرت کی محفلیں درہم برہم ہو گئی تھیں۔ شعراء اور فضلاء کی درباری قدر و منزلت ختم ہو چکی تھی تمام قوم پر ایک قنوطیت طاری تھی۔ مایوسی اور ناکامی کا دور دورہ تھا۔ امید اور خوشحالی کی کوئی جھلک بھی نہ دکھائی دیتی تھی۔ تباہی اور بربادی کے ہیبت ناک مناظر نے دلوں کو سرد

کر دیا تھا اور تعلقات دنیوی سے بے تعلق۔ یہ ناممکن تھا کہ اس عظیم الشان انقلاب کا اثر ادبیات عصر پر نہ ہوتا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شجاعانہ جذبات کے فنا ہو جانے کی وجہ سے رزمیہ نظم کا بالکل خاتمہ ہو گیا تھا۔ مصیبت اور بربادی نے دنیوی لذتوں سے محروم کر کے خدا کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور ہر شخص تصوف کے ظل عافیت میں پناہ لیتا نظر آتا تھا۔ عشق مجازی عشق حقیقی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں اور دوسرے اصناف سخن میں مضامین تصوف نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان ہونے لگے۔ دنیا کی بے ثباتی، قناعت اور نیرنگئ عالم کے بیانات نہایت موثر طریقہ پر بیان ہوئے شعرا کو درباری سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اس لئے شاعری میں آزادی کی روح آئی۔ قصیدہ گوئی بالکل برائے نام رہ گئی اور اس میں بھی علمی و فنی اصطلاحات کی کثرت، لفظی بازیگری اور مبالغہ کی جگہ سلاست مضمون آفرینی اور روانی نے لے لی۔ چونکہ تخیل کی دنیا مٹ چکی تھی۔ مبالغہ کی کارفرائی ختم ہو گئی تھی۔ اور لفظی صناعی کی کوئی قدر نہ رہی تھی۔

اور ان سب کی جگہ متانت، سلاست اور صحت بیان نے لے لی تھی۔ اس لئے اس زمانہ میں نظم سے زیادہ نثر لکھی گئی۔ اور یہ تمام محاسن اس عہد کی نثر میں موجود ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے چودھویں صدی کے آخر میں جب ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔ اور درباری نوازشوں کی پھر بارش ہوئی تو ایک بار پھر وہی طرز عود کر آیا جو دور متوسطین کا صحیح رنگ ہے۔ ساقی، شراب، وصل و ہجر کی وہ شاعرانہ اصطلاحات جو عشق حقیقی کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ پھر مجازی رنگ میں رنگ گئیں۔ ذیل میں اس دور کے مشہور شعرا اور مصنفین کا تذکرہ کیا جاتا ہے:۔

(۵) منہاج سراج صاحب طبقات ناصری (۱۲۶۰) ابن عطا ملک جوینی (۱۲۸۳) نے ۱۲۶۰ء میں تاریخ جہاں کشا لکھی جس میں آل منگول کی تاریخ ہے (۶) محمد عوفی نے فارسی شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ لباب الالباب مرتب کیا۔ خواجہ نصیر الدین طوسی (۱۲۷۴ — ۱۲۰۰) نے عربی زبان میں علوم دین پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی میں اُن کی تصانیف اخلاق ناصری معیار الاشعار اور زیج ایلخانی زبان اور طرز ادا کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔ دنیائے تصوف کے اصحاب ثلاثہ کے آخری رکن (۷) مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷ — ۱۲۷۳) ہیں۔ مثنوی مولانا روم بلاشبہ فارسی زبان کی ممتاز ترین کتابوں میں سے ہے۔ اور معنوی اعتبار سے اس دور کی بہترین تصنیف ہے۔ آپ کا دیوان جو حضرت شمس تبریزی کے نام سے منسوب ہے۔ غزلیات پر مشتمل ہے۔

(۸) خلاق المعانی کمال الدین اسمٰعیل (۱۲۳۷) مشہور قصیدہ گو شاعر تھے۔ آخر عمر میں تعلقات دنیوی سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ رشید الدین فضل اللہ جو عرصہ تک ایلخانی امرا کے دربار میں وزارت کے عہدہ پر ممتاز رہے۔ جامع التواریخ کے مصنف تھے ۱۳۱۸ء میں ایک سازش کے ماتحت آپ کو قتل کر دیا گیا۔

۱۳۱۲ء میں عبداللہ وصاف نے تاریخ وصاف تصنیف کی جو صنائع لفظی اور مرصع و مقفیٰ عبارت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس رنگ تحریر کا یہ اثر ہوا کہ انشا پردازی کا مذاق ہی تبدیل ہو گیا۔

(۹) حمد اللہ مستوفی نے بہت سی مفید کتابیں لکھیں۔ جن میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ تاریخ گزیدہ (۱۳۳۰) سلیس فارسی میں دنیا کی تاریخ ہے۔ اس میں مصنف نے مختلف قرون کے مشائخ، ائمہ، حکما اور اطباء

اور شعراء و مصنفین کا بھی ذکر کیا ہے۔ ظفر نامہ (۱۲۳۵) شاہ نامہ فردوسی
کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ اور محققین یورپ کا خیال ہے کہ "تاریخی اعتبار سے
یہ نظم نہایت صحیح اور مفید ہے"۔ نزہت القلوب فارسی زبان کا قدیم
ترین جغرافیہ۔ تفسیر بیضاوی کے مصنف (۱۰) قاضی نصیر الدین بیضاوی نے
بھی ایک تاریخ موسومہ ناظم التواریخ مرتب کی۔ ... خ بناکتی (۱۳۱۷)
(۱۱) مصنف ابو داؤد سلیمان بناکتی۔ اس کے متعلق یورپ ... اُن کا خیال

ہے کہ "مصنف نے علاوہ تاریخ اسلام، تاتار و ایران کے محقق حالات
بہم پہنچانے کے جزائر برطانیہ، فرانس، روس، پرتگال کے
بھی صحیح حالات لکھے ہیں۔ اور یہ بات مسلمان مورخین میں بہت کم پائی
جاتی ہے۔" شہنشاہ نامہ (۱۳۲۸) اور غازان نامہ (۱۳۶۴) منظوم تواریخ
اگرچہ اس دور کے بعد کی تصانیف ہیں۔ مگر چونکہ ان کتابوں میں ان سلاطین
کا ذکر ہے جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن کا تذکرہ بھی کیا
جاتا ہے۔ (۱۲) قانعی طوسی جس نے کلیلہ دمنہ کا قصہ نظم کیا اور تاریخ
منگول نظم میں لکھی۔ نہایت پرگو شاعر تھا۔ اسی لئے باوجود کوئی معنوی
حیثیت نہ رکھنے کے ملک الشعراء کے خطاب سے متصف تھا۔
(۱۳) عراقی ایران کا مشہور صوفی شاعر (۱۲۸۹) تھا۔ غزل میں تصوّف کا
رنگ غالب ہے۔ مسائل تصوف نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں
تصوّف پر ایک کتاب لمعات لکھی جس کا طرز بیان نہایت دلکش ہے
(۱۴) اوحد الدین کرمانی نے حضرت شمس الدین تبریزی اور (۱۵) شیخ محی الدین
ابن عربی اور مولانا روم سے فیض صحبت حاصل کیا تھا۔ مذاق تصوّف
میں رنگے ہوئے تھے۔ آپ کی مشہور تصنیف مصباح الارواح حقایق
و معارف پر ہے۔

(۱۶) اوحدی اصفہانی (۱۳۲۸ء) کرمانی کے مرید تھے آپ نے بھی مرشد کی تقلید میں ایک مثنوی جام جم لکھی۔ اس کے علاوہ ایک دیوان یادگار چھوڑا۔ جس میں غزل، قصیدہ، رباعی ہر ایک صنفِ سخن موجود ہے۔

ایک دوسرے مشہور صوفی شاعر (۱۷) محمود شبستری تھے۔ ذی
گلشن راز تصوف کے متعلق پندرہ سوالوں کا مشرح جواب ملا
عبدالرزاق لاہجی نے اس کی شرح لکھی ہے۔ آپ کی نثری
تصانیف حق الیقین اور رسالہ شاہد ہیں (۱۸) بہاء الدین ولد (۱۳۲۶)
مولانا روم کے صاحبزادے تھے۔ آپ کی مثنوی رباب نا رف
تصوف کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے بلکہ اس میں مولانا ر مستند
حالات پائے جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ (۱۹) پور بہائے جامی (۲۰) امامی ہروی (۱۲۶
(۲۱) ہمام تبریزی (۱۳۱۴ء) (۲۲) اور نزاری قہستانی (اس دور
کے دوسرے قابل ذکر شعراء ہیں۔

---

(۸)

ابتدائی دورِ تیموریہ

(۱۳۳۵ - ۱۴۰۵)

سلطان ابوسعید کے انتقال کے بعد منگول سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔
تاریخی اہمیت کے اتفاقات میں سے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سلطان ابوسعید کی وفات اور تیمورِ اعظم کی ولادت ایک ہی سال یعنی ۱۳۳۶ء

میں ہوئی۔ یہ دور جو سلطان ابو سعید کی وفات سے شروع ہو کر تیمور کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ تقریباً ۷۰ سال کا زمانہ ہے۔ منگول کی مرکزی حکومت ختم ہو جانے پر ایران میں بہت سی چھوٹی چھوٹی آزاد سلطنتیں پیدا ہوئیں۔ جو تیمور کے حملہ تک ایرانی نظم و نسق کی ذمہ دار ہیں۔ ان سلطنتوں کا مختصر تذکرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

خاندانِ جلائر | خاندانِ جلائر کے پہلے بادشاہ شیخ حسن بزرگ نے بغداد اور تبریز پر ۱۳۴۰ء سے پہلے قبضہ کر لیا تھا۔ مگر ۱۳۴۳ء میں حسن کوچک بن امیر چوپان کے انتقال کے بعد اس کو سکون نصیب ہوا۔ اس لئے کہ گذشتہ سات برس میں مسلسل امیر چوپان کی اولاد اور حسن میں لڑائیاں ہوتی رہی تھیں۔ ۱۳۵۶ء میں حسن کے انتقال کے بعد سلطان محمد اویس تخت نشین ہوا۔ اور ۱۸ برس پورے انتظام و اہتمام کے ساتھ حکومت کی۔ ارباب علم و فضل کا بڑا قدردان تھا۔ وہ خود اگر کوئی متبحر عالم نہ تھا۔ تو علم سے بے بہرہ بھی نہ تھا اس کے بھائی احمد نے ۱۳۸۲ء سے ۱۴۰۹ء تک حکومت کی ان کے انتقال کے بعد خاندان جلائر کا زوال شروع ہو گیا۔ خاندانی مناقشات اس قدر بڑھ گئے کہ ایک بھائی دوسرے کے خون کا پیاسا نظر آنے لگا۔ اور ان خانہ جنگیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۴۱۱ء میں ترکمانوں کی اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

(۱) سلمان ساوجی جیسا بلند مرتبہ قصیدہ گو وابستگان دولت میں تھا۔ حسن بزرگ کے دربار میں سلمان کو بڑا اعزاز حاصل تھا۔ اس کی بیگم دلشاد خاتون سلمان کی بڑی قدردان تھی اور وہ بھی بڑے جوش کے ساتھ اس کی مدح کرتا تھا۔ حسن کے بعد سلطان اویس چونکہ خود شاعر تھا اس لئے سلمان کا اعزاز نہ صرف برقرار رہا بلکہ بادشاہ

کے استاد ہو جانے سے اور بڑھ گئی۔

خاندان مظفریہ اس خاندان کا بانی امیر غیاث الدین حاجی خراسانی تھا۔ منگولی حملوں کے زمانہ میں خراسان چھوڑ کر یزد میں آباد ہو گیا تھا۔ مبارز الدین محمد ۱۳۱۳ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ خاندان مظفریہ کا پہلا بادشاہ سمجھا جاتا ہے (۲) خواجو کرمانی اسی کے دربار کے شاعر تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کے حدود بہت وسیع کئے اور جلد ہی شیراز اور اصفہان ابو اسحق انجو سے چھین لیا اور پھر تبریز پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ ۱۳۶۳ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کے بعد اس کا لڑکا شاہ شجاع تخت نشین ہوا۔ شاہ شجاع صرف ایک بہادر جنرل اور بیدار مغز حکمران ہی نہ تھا۔ بلکہ نغز گو شاعر اور اعلیٰ خطاط بھی تھا (۳) خواجہ حافظ شیرازی فارسی غزل کے مجتہد اعظم اسی کے دربار سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ مولانا قوام الدین ایک بلند پایہ عالم اور مدرس بھی اسی کے زمانہ میں تھے۔ سید شریف جرجانی کا مدرسہ دار الشفاء بھی اسی کے عہد کی یادگار ہے۔ ۱۳۸۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اور زین العابدین تخت کا وارث ہوا۔ ابھی تین برس بھی حکومت نہ کر سکا تھا کہ تیمور کا دوسرا حملہ ۱۳۹۳ء میں ہوا۔ اور اس کا خاندان تباہ ہو گیا۔ اور بہت سے اعزا قتل ہوئے اور بعض قید کر لئے گئے۔

خاندان کرت تاج الدین عثمان اس خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ ملک رکن الدین ابو بکر اس کا بیٹا تھا۔ جس کا لڑکا شمس الدین ۱۲۴۶ء میں تخت و تاج کا مالک ہوا۔ ۱۲۴۸ء میں وہ منگول شہنشاہ منگول خاں کے دربار میں خراج وفاداری پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا اور متعدد صوبوں کی حکومت کا فرمان حاصل کیا۔ ۱۲۷۸ء میں اس کو زہر دیا گیا۔ اس کے بعد رکن الدین جانشین ہوا۔ اگرچہ اس کا انتقال ۱۳۰۵ء میں

میں ہوا۔ لیکن اس کی زندگی میں اس کا لڑکا فخرالدین سلطنت پر قابض ہو چکا تھا۔ اس کا دورِ حکومت باپ کے انتقال کے بعد سے شمار کیا جاتا ہے۔ (۱۳۰۷ - ۱۲۰۵) یہ بڑا علم دوست اور صاحبانِ علم و فن کا مربی تھا۔ ۳) سیفی جو اس کے دربار کا شاعر تھا اس کی سخن پروری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: "چالیس بلند پایہ شعراء اس کی مدح سرائی کرتے تھے اور خود میں نے سلطان کی مدح سرائی میں ۸۰ قصائد اور ۵۰ اقطعات لکھے"۔ سلطان فخرالدین کا عہد معاشرتی اصلاحات کے لئے ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اس نے عورتوں کو بے پردہ نکلنے کی ممانعت کر دی تھی۔ شراب نوشی اور شاہراہِ عام پر ماتم کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ اس کے بعد غیاث الدین (۱۳۲۹ - ۱۳۰۷) شمس الدین (۱۳۲۹ - صرف ۲ ماہ کیلئے) حافظ (۱۳۳۱ - ۱۳۲۹) مسند حکومت پر فائز ہوئے۔ ۱۳۳۱ء میں ملک معزالدین مالک تخت ہوا۔ زاوا کی لڑائی میں دربار سربدار کا شاعر (ہ) ابن یمین جنگ کے قیدیوں کے ساتھ گرفتار ہو کر آیا۔ سلطان نے اس کا پر تپاک خیر مقدم کیا اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ اس سلطان علم پرور نے ۱۳۷۰ء میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اس کے بعد غیاث الدین پیر علی (۱۳۸۱ - ۱۳۷۰) اور پیر محمد بادشاہ ہوئے۔
تیمور نے پیر محمد سے اپنی بھتیجی کا عقد کر دیا تھا مگر پھر حملہ کر کے سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا۔

خاندانِ سربدار | اس خاندان کا تذکرہ کرتے ہوئے مشہور مؤرخ لین پول نے لکھا ہے۔ "تقریباً نصف صدی تک یہ خاندان سبزوار اور قرب و جوار کے اضلاع پر حکمران تھا۔ اس

عرصہ میں بارہ امراء نے حکومت کی جن میں ۹ نہایت بیدردی سے قتل کیے گئے۔" اس خاندان کا آخری بادشاہ خواجہ علی سوید تھا جس نے حدودِ سلطنت بہت وسیع کر لی تھیں ۱۳۸۶ء میں یہ خاندان بھی امیر تیمور کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ اس خاندان کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ۱۳۳۲ء میں عبد الرزاق نامی ایک شخص نے یہ کہہ کر علم بغاوت بلند کیا کہ "یا تو ہم دشمنوں کا خاتمہ کر دیں گے یا اپنا سر دار (سولی) کے حوالہ کر دیں گے۔" فارسی کا مشہور غزل گو شاعر ابن یمین اسی دربار کا متوسل تھا۔

امیر تیمور امیر تیمور کی شہرت کا سبب وہ حملہ ہے۔ جو اس نے ۱۳۷۰ء میں ماوراء النہر کے علاقہ میں سلطان حسن کی سلطنت پر کیا اور جس کے بعد صاحب قران' کا لقب اختیار کیا۔

۱۳۸۱ء میں وہ ایران کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت سے لے کر وفات تک (۱۴۰۸) اس کی زندگی جنگ آزمائی اور فتوحات کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہے۔ ممالک اسلامی کو تباہ و برباد کیا۔ ایران میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتیں۔ اس لیے اُن کی فتح میں تیمور کو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ہزارہا شہر ویران کیے۔ ملک کے ملک تاخت و تاراج کر دیے۔ سینکڑوں سلطنتوں کا نام صفحہ ارض سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ غرض دنیا میں ایک بار پھر چنگیز خاں اور ہلاکو کی یاد تازہ کر دی۔ لیکن تیمور اور چنگیز کا یہ فرق کبھی نہیں بھلایا جاتا کہ چنگیز لامذہب تھا۔ اور معابد و مقابر اور علماء و صلحا کی اُس کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ اور تیمور اگرچہ صرف نام ہی کا مسلمان تھا۔ لیکن پھر بھی مقدس مقامات اور مقدس

ہستیوں کی ایک وقعت اُس کے دل میں ضرور تھی۔ اور اس لئے باوجود اس کے کہ اُس کی فتوحات کا پیراہن سر بسر خون میں رنگین ہے۔ لیکن چنگیز و ہلاکو کے برعکس اس کا دامن ان بدنما داغوں سے بہت کم آلودہ نظر آتا ہے۔

صاحب صنادید عجم نے اس کی خوں ریزی کی تاویل ان الفاظ میں کی ہے۔ "حقیقت یہ ہے کہ تیمور نہ" دجال کذاب" تھا نہ "صفات جلالیہ و قہریہ الٰہی کا مظہر" بلکہ ایک ملک گیر اور سخت مزاج بادشاہ تھا۔ سکندر ہو یا چنگیز، تیمور ہو یا نپولین کسی ملک گیر کی نظر میں انسان کی زندگی کوئی چیز نہیں۔ لڑنا۔ مرنا۔ قتل و غارت کرنا اُن کا کام ہے اسی میں اُن کی کامیابی"۔ اُس کی سلطنت جنوبی روس سے لے کر ایران، ہند کے شمالی مغربی حصے، روم و عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ ایران میں اس زمانہ میں بہت کم سکون اور اطمینان رہا چھوٹے چھوٹے خاندان ملک کے مختلف حصوں پر قابض تھے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی دوسرا خاندان اس سے زیادہ طاقتور پیدا ہوتا تو وہ قابض ہو جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر خوش گو شعراء اور بلند پایہ نثر نگار اس زمانہ میں پیدا ہوئے، دورِ

صفویہ بھی نہ پیش کر سکا، حالانکہ اس عہد میں مرکزی حکومت بھی تھی اور امن و سکون بھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شعراء کی پرورش و قدردانی ہمیشہ درباروں میں ہوئی، انعامات و وظائف پر انکی زندگی کا دارومدار تھا۔ لیکن اُس کے باوجود شاعر نازک طبعی کی وجہ سے بعض اوقات درباری قیود اور شاہانہ پابندیوں سے گھبرا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں چونکہ بہت سے دربار تھے۔ اور وہ سب رقابت کی وجہ سے

شعرا کی قدر ایک دوسرے سے زیادہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کبھی کوئی شاعر ایک دربار سے گھبراتا یا معتوب ہوتا تو وہ "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ تھا بلکہ اس کے لئے اور دروازے بھی کھلے ہوئے تھے مرکزی حکومت کی صورت میں یہ ممکن نہ ہوسکتا تھا۔ دوسرے صرف ایک دربار میں چند شعرا ہی چمک سکتے تھے اور حریفانہ کشمکش کی وجہ سے کسی غیر کو چمکنے کا موقع بھی نہ دیتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ ایسا شاعر جو دربار میں رسائی حاصل نہ کرسکتا تھا گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اس زمانہ میں یہ صورت نہ تھی۔ مختلف درباروں کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ اور شعرا کی ایک بڑی تعداد ان سے وابستہ تھی اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس زمانہ میں نظم کا سرمایہ نثر سے نہ صرف یہ کہ زیادہ ہے بلکہ بہتر بھی ہے۔ فارسی تاریخِ ادب کا کوئی دور۔ حافظ، ابن یمین سلمان ساوجی، خواجو کرمانی جیسے شعرا یکجا نہیں پیش کرسکتا۔ اس دور کے طرز میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی وہی لفظی صناعی، مبالغہ اور تصنع یہاں بھی موجود ہے۔ ابتدائی دور میں نظم کا سرمایہ نثر سے زیادہ ہے۔ اور آخر دور میں اس کے برعکس۔ لیکن اس زمانہ کی نثر میں بھی وہی شاعرانہ صناعی، اور تصنع موجود ہے جو اس دور کی خصوصیت ہے۔ غزل گو شعرا کی تعداد زیادہ ہے۔ اور تقریباً سب تصوف سے متاثر نظر آتے ہیں، اور نثر میں بھی یہ اثر نمایاں ہے اس دور کے مشہور شعرا یہ ہیں۔

ابن یمین (۱۳۶۸) ایک غزل گو شاعر تھا۔ اس کا دیوان ضائع ہوگیا جو غزلیں ہمارے سامنے ہیں۔ وہ فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات

سے پُر ہیں۔ غزل کی چاشنی کو اس کے تصوف اور فلسفہ نے پھیکا نہیں ہونے دیا۔ خواجو کرمانی (۱۲۸۱-۱۳۵۲) کا سرمایہ شاعری علاوہ قصائد، غزلیات اور قطعات کے پانچ مثنویاں ہیں۔ نوروز وگل (۱) ہما و ہمایوں (۲) ریش نامہ (۳) روضۃ الانوار، اور ایک اور مثنوی۔ غزل گوئی اُن کا خاص جوہر تھا (۲) عبید زاکانی (۱۳۷۱) اس دور کا سب سے بڑا ہجوگو اور ظریف شاعر تھا۔ اس کی چند مشہور تصنیفات یہ ہیں۔ (۱) اخلاق الاشراف (۲) ریش نامہ (۳) رسالہ صد پند (۴) رسالہ تعریفات (۵) رسالہ دلگشا۔ (۶) عشاق نامہ (۷) فال نامہ، اس کی مشہور طنزیہ نظم موش گربہ بہت مشہور ہے (۷) عماد فقیہ کرمانی (۱۳۷۲) ایک عمدہ غزل گو شاعر تھے۔ دو مثنویاں محبت نامہ (۱۳۲۲) اور مونس الابرار (۱۳۶۴) اُن کی یادگار ہیں۔ سلمان ساوجی (۱۳۷۶-۱۳۰۰) خاندان جلائر کا باکمال قصیدہ گو شاعر تھا۔ اس کے قصائد قدمار اور معاصرین سے بعض اعتبارات سے بہتر ہیں۔ غزل رباعی، اور قطعات کے علاوہ دو مثنویاں فراق نامہ اور جمشید و خورشید یادگار چھوڑیں۔

فارسی کا بہترین غزل گو اور آسمان شاعری کا درخشندہ ستارہ حافظ شیرازی (۱۳۸۹) جس کے والہانہ ترانوں اور عارفانہ نغموں سے آج تک فضائے ادب گونج رہی ہے۔ اسی دور کا مایہ افتخار تھا۔ آج تک اس کا دیوان فارسی غزل میں ایک صحیفۂ آسمانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی تقلید نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے (۸) کمال خجندی (۱۴۰۵) ایک غزل گو شاعر تھا۔ جس کے دیوان کا صرف ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے (۹) مغربی تبریزی (۱۴۰۷-۱۳۵۰) اس دور کے بلند مرتبہ صوفی

اور عالم سے تھے آپ کا دیوان معارف و حقایق کا مجموعہ ہے۔
جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس دور میں نثر کا سرمایہ شاعری کے مقابلہ میں کم ہے (۱۰) میعار جمالی مصنفہ شمس الدین محمد بلاغت کی ایک عمدہ کتاب ہے (۱۱) مواہب الٰہی از معین یزدی (۱۳۸۶) خاندان مظفریہ کی مبسوط تاریخ ہے۔ جس میں اکثر واقعات چشم دید ہیں لیکن تاریخ وصاف کی طرح طرز بیان نہایت مشکل ہے۔ عبارت گنجلک اور صنعتوں سے پر ہے۔ شیراز نامہ مصنفہ (۱۲) شیخ فخرالدین ابوالعباس احمد شیرازی (۱۳) مولانا نظام الدین شامی نے تیمور کی فرمائش پر اس کے عہد کی ایک تاریخ لکھی جو غالباً ۱۴۰۴ میں مکمل ہوئی۔

---

(۹)

آخر دور تیموریہ

(۱۴۰۵—۱۵۰۲)

تیمور کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے جہانگیر اور عمر شیخ مرزا اس کی زندگی ہی میں مر گئے تھے۔ اور تیسرا لڑکا میران شاہ تیمور کی وفات کے بعد راہی ملک بقا ہوا۔ ۱۴۰۵ء میں چوتھا لڑکا شاہ رخ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس نے ۴۲ برس نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔ شاہ رخ نے علماء اور فضلاء کی بڑی ہمت افزائی کی اور ان کو انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔ وابستگانِ دامن دولت میں حافظ ابرو صاحب زبدۃ التواریخ، فصیحی، کمال الدین عبدالرزاق مصنف

مطلع السعدین جیسے مورخ اور شاہ نعمت اللہ اور قاسم انوار جیسے شعرا شامل تھے۔ اس شاہ سخن پرور نے ۱۴۴۷ء میں وفات پائی اور پانچ لڑکے اور متعدد دعوے دار تخت کے دعوے دار چھوڑے۔ اس کا ایک بیٹا بائسنقر جس کا انتقال اوائل ۱۴۳۳ء میں ہوا۔ خود بھی بڑا عالم تھا اور علماء اور فضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس کا دربار ماہرین علوم و فنون کا مرجع تھا۔ عارفی صاحب مثنوی گوے و چوگان اسی کے دربار کا شاعر تھا۔ ۱۴۴۷ء میں میراں شاہ کا لڑکا الغ بیک تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے سمرقند میں مشہور رصد گاہ تعمیر کی اور خود زیج الغ بیگی مرتب کی جو علم ہندسہ اور ہیئت کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے ابھی دو ہی برس حکومت کر سکا تھا کہ اس کے بیٹے عبداللطیف نے ۱۴۴۹ء میں اسے قتل کرا کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن وہ خود بھی سال بھر سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ اور بالآخر ۱۴۵۰ء میں قتل کر دیا گیا۔

بقیہ نصف صدی میں یا تو اس خاندان کے امراء آپس میں لڑتے رہے یا ترکمانوں سے جنگیں ہوتی رہیں۔ مرزا ابوالقاسم بابر ابن بائسنقر عبداللطیف کے بعد مالک تخت ہوا۔ اور اپنی کمزوری کی وجہ سے جہاں شاہ ابن قرا یوسف سے شکست کھائی اور متعدد صوبے ہاتھ سے نکل گئے۔ سلطان ابوسعید میراں شاہ کے پوتے کو بھی ترکمانوں سے شکست ہوئی اور بالآخر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے دو بیٹے احمد اور محمود حاکم ہوئے۔ ۱۴۶۸ء میں سلطان حسین تخت نشین ہوا۔ ایک عرصہ کے بعد ملک میں امن و سکون قائم ہوا۔ اس نے ۳۸ برس تک حکومت کی اور ۱۵۰۶ء میں انتقال کیا۔ شاہ رخ کے بعد یہ دوسرا فرماں روا تھا۔ جس نے اہل فن کی قدر کی۔ جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ اس کے دربار میں معین الدین صاحب روضۃ الجنت میرخوند، دولت شاہ سمرقندی مصنف تذکرہ دولت شاہ، ملا حسین کاشفی جیسے علماء اور مولانا جامی جیسے بزرگ شاعر جمع تھے۔ اس کا وزیر میر علی شیر متخلص بہ نوائی ترکی و فارسی کا ادیب و شاعر تھا۔ مولانا جامی کا بڑا قدردان تھا۔ خود بھی ماہر موسیقی تھا۔ اور بہزاد و شاہ مظفر جیسے ماہرین فن اس کے دربار کی زینت تھے۔ اس نے ۱۵۰۱ء میں دارِ فانی سے انتقال کیا۔

آخر دورِ تیموریہ میں دو ترکمانی خاندان قرا قیونلو اور آق قیونلو برسرِ حکومت تھے۔ جن کا مختصر حال ذیل میں دیا جاتا ہے

خاندان قرا قیونلو ۱۳۸۰–۱۴۶۹

اس خاندان کا سب سے پہلا حکمران بیرام خواجہ تھا۔ تیمور کے عہد میں یہ آذربائیجان میں آکر آباد ہوا۔ اس کے بعد قرا محمد ۱۳۸۱ء میں تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس خاندان کا پہلا آزاد حکمران قرا یوسف تھا۔ جس نے ۱۳۹۰ء میں اپنی خود مختاری کا تبریز میں اعلان کیا۔

قرا یوسف کا انتقال ۱۴۲۰ء میں ہوا۔ اس کے دو بیٹے تھے قرا اسکندر اور جہاں شاہ۔ پہلے قرا اسکندر وارث قرار پایا۔ کاتبی نیشاپوری اس دور کا مشہور قصیدہ گو اسی کے دربار کا شاعر تھا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا بھائی جہاں شاہ مالک حکومت ہوا۔ ۱۴۶۷ء میں اوزون حسین نے اس کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی اور بالآخر ۱۴۶۹ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

خاندان آق قیونلو

اس خاندان کا پہلا امیر بہاء الدین قرا عثمان تھا۔ اس نے دیار بکر کو اپنا مستقر قرار دیا۔ ۱۴۳۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اور اس کا بیٹا علی بیگ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد جہانگیر

اور اوزون حسن یکے بعد دیگرے تخت کے وارث ہوئے۔ جلال الدین
دوانی مصنف اخلاق جلالی کی سرپرستی کا فخر اس کو حاصل تھا۔ اس کے
انتقال پر ۱۴۷۸ء میں اس کا لڑکا خلیل بادشاہ ہوا لیکن چھ ماہ کے بعد
اس کے بھائی یعقوب نے اس کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور سنہ ۱۴۹۰ء
تک حکومت کی۔ اس کے بعد بائیسنغر اور رستم حکومت پر فائز رہے اور
بالآخر شاہ اسمٰعیل صفوی نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس دور کی خصوصیات
کا تذکرہ گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے ذیل میں موتر شعراء اور مصنفین کا
ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) حافظ ابرو (۱۴۳۰) مصنف زبدۃ التواریخ (۱۴۲۷) ایک کتاب علم جغرافیہ
کے متعلق بھی لکھی ہے (۲) فصیحی مصنف مجمل (۳) کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی
(۱۴۸۲-۱۴۱۳) نے مطلع السعدین تاریخ دور منگولیہ تصنیف کی جس میں سلطان
ابوسعید منگولی کی ولادت سے سلطان ابوسعید تیموری کی وفات تک کا حال
درج ہے (۴) معین الدین محمد صاحب روضۃ الجنات فی تاریخ مدینہ ہرات
اس میں علاوہ ہرات کی تاریخ کے دیگر ہمعصر بادشاہوں کا حال بھی
درج ہے (۵) دولت شاہ سمرقندی مصنف "تذکرہ دولت شاہ" شعراء اور
سلاطین کا سب سے بہتر تذکرہ (۶) میر علی شیر نوائی وزیر سلطان حسین
یہ ترکی اور فارسی کا ادیب تھا (۷) سلطان حسین ابوالغازی خاندان تیموریہ
کا مشہور فرمانروا مصنف تذکرہ مجالس العشاق (۸) کمال الدین حسین
(۱۴۳۵) نے مولانا روم کی مثنوی کی شرح لکھی (۹) شاہ نعمت اللہ کرمانی
(۱۴۳۱-۱۳۳۰) ایک عالی مرتبت صوفی تھے۔ آپ نے مسئلہ وحدت
الوجود کو نظم میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے (۱۰) قاسم الانوار (۱۴۳۴-۱۳۵۶)
انھوں نے علاوہ غزلیات کے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔
ناظر و منظور، حسن و عشق، ابرام و گل اندام (۱۱) نورالدین عبدالرحمن جامی

(۱۴۱۴-۱۴۹۲) ایک بے مثل ادیب اور بلند پایہ شاعر تھے۔ اور بلاشبہ ایسے کامل و فاضل تھے کہ ان جیسا ہمہ داں اور ہمہ صفت متصف شخص تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ آپ کی صرف چند تصنیفوں کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔
سات مثنویاں موسوم بہ ہفت اورنگ (۱) سلسلۃ الذہب (۱۴۸۵)

(۲) سلمان و ابسال (۳) تحفۃ الاحرار (۱۴۸۱) (۴) سبحۃ الابرار (۵) یوسف زلیخا (۱۴۸۳) (۶) لیلیٰ مجنوں (۱۴۸۴) (۷) اور خرد نامہ سکندری تین دیوان یادگار چھوڑے۔ فاتحہ الشباب، واسطۃ العقد اور خاتمۃ الحیات۔ قرآن شریف کے مختلف حصوں کی تفسیر لکھی (۲) ملا حسین واعظ کاشفی (۱۵۰۵) تفسیر قرآن کے علاوہ اُن کی مشہور تصانیف روضۃ الشہداء اخلاقِ محسنی اور انوار سہیلی ہیں (۳) جلال الدین دوانی (۱۴۲۷-۱۵۰۳) مصنف اخلاقِ جلالی۔

(۱۰)

دورِ ہندیہ

(۱۲۵۲ — ۹۴۱)

ہندوستان میں فارسی کی ابتدا اسلامی حملوں کے ساتھ ہوتی ہے تمام مسلمان حملہ آور وسطی ایشیا اور ایران سے آئے۔ وہاں کے دربار علماء اور فضلاء کے مرکز تھے۔ جنگوں میں لشکر کے ساتھ علماء و شعرا سے دربار ہوتے تھے۔ ہندوستان کی فتح کے بعد ان میں سے اکثر یہاں رہ پڑے اور اس طرح ہندوستان میں فارسی ادب و شعر

کی آبیاری شروع ہوئی۔ مغل سلطنت کے قیام کے بعد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں بھی علماء اور شعراء کی آمد و رفت منقطع نہیں ہوئی۔ فرق یہ ہو گیا کہ پہلے فاتحین کے ساتھ وابستگانِ دامن دولت کی حیثیت سے آتے تھے۔ اب ایران میں قدر نہ ہونے کے باعث، ہندوستانی امراء اور سلاطین کی قدر شناسی کی شہرت سے متاثر ہو کر آتے تھے

اس باب میں ہم اُن شعراء اور مصنفین کا ذکر کریں گے جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر فارسی شعر و ادب کی خدمت کی۔ سہولت کے لئے اس دور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے (۱) ماقبل دورِ مغلیہ (۲) دورِ مغلیہ۔

ماقبل دورِ مغلیہ

(۱) منہاج السراج جرجانی ناصر الدین محمود کے دربار سے متعلق تھے اور طبقات ناصری ۱۲۶۰ء میں تصنیف کی۔ (۲) امیر خسرو ہندوستان کے فارسی شعراء کے امام ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ غیاث الدین بلبن کے بیٹے بغرا خاں نے آپ کو انعامات سے سرفراز کیا کیقباد کی فرمائش پر مثنوی قران السعدین لکھی غلام سلطنت کے ختم ہو جانے پر خاندان خلجی برسرِ اقتدار ہوا۔ آپ نے تاج الفتوح لکھ کر جلال الدین خلجی سے امیر کا خطاب اور مرتبہ امارت حاصل کیا علاء الدین خلجی کے لئے خمسہ نظامی کا جواب لکھا۔ اور غیاث الدین تغلق کی فرمائش پر تغلق نامہ لکھ کر سرفرازی حاصل کی۔ اور اسی عہد میں ۱۳۲۵ھ میں انتقال ہوا (۳) جمال الدین دہلوی بن حسام الدین محمد بن تغلق شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ (۴) حسن دہلوی امیر خسرو کے دوست تھے۔ سلطان محمد قاآن کے دربار میں دونوں ہمراہ تھے (۵) بدر الدین بدر چاچ نے

محمد تغلق شاہ اور دوسرے بادشاہوں کی مدح سرائی میں عمر بسر کی۔

ہندوستان میں اس دور میں ایسے سلاطین بھی گزرے ہیں جو خود صاحب دیوان شاعر تھے۔ اسی لئے شعرا کی قدر اور زیادہ بھی چونکہ ان کا کوئی خاص مرتبہ بحیثیت شاعر کے نہیں ہے۔ اس لئے محض نام درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے (۶) فیروز شاہ بہمنی (۱۴۲۱ء) (۷) یوسف عادل شاہ (۱۵۱۰ء) (۸) اسمٰعیل عادل شاہ وفائی (۱۵۳۴ء) (۹) اور نظام شاہ بہری۔

اس وقت تک ہندوستان میں فارسی کی حیثیت محض ایک علمی زبان کی تھی۔ اس لئے کہ ادب و شعر، اور علوم مذہبی کی اشاعت کے لئے دوسرا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لیکن حکومت کی سرپرستی اور فارسی دانی کا وجہ ترقی ہونا سکندر لودی کے زمانہ سے شروع ہوا۔ سکندر لودی نے تخت نشینی کے بعد ان امرا اور ملازمین کو ترقی دی جو فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ رعایا کے دل میں فارسی دانی کا شوق پیدا ہوا اور علاوہ مسلمانوں کے کہ ان کو تو فارسی سے ایک دور کا تعلق بھی تھا۔ خود ہندوؤں نے فارسی پڑھنی شروع کر دی۔ اور اس طرح فارسی کے الفاظ اور فقرے عوام کی زبانوں پر چڑھ گئے۔ ابرج بھاشا کے شعرا ان کو استعمال کرنے لگے۔ ادھر فارسی میں ہندوستانی رسوم اور ہندوستانی اشیاء کے نام داخل کئے گئے۔ اور یہیں ہندوستانی فارسی کا سنگ بنیاد رکھا گیا

(۱۰) سکندر لودی المتخلص بہ گل رخی اعلیٰ درجہ کا سخن فہم اور سخن گو تھا۔ بدایونی کی روایت کے مطابق شیخ جمال کمبوہ دہلوی سے مشورہ سخن کرتا تھا۔ اس کے دربار میں بہت سے علماء اور شعرا جمع تھے۔ علمی مباحثے منعقد ہوتے تھے۔ اور خود بادشاہ ان میں شرکت کرتا تھا۔

اس کے دربار کے دوسرے نثار اور شعرا میں تین نام قابل ذکر ہیں۔
(۱۱) شیخ جمال کمبوہ دہلوی بڑے صوفی اور بزرگ تھے اور جیسا کہ
اوپر لکھا جا چکا ہے۔ سلطان کے استاد تھے۔ سیر العارفین تذکرۂ اولیائے
ہند آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ (۱۲) شیخ اللہ دیا جونپوری آپ نے شرح
کافیہ اور دوسری مذہبی رنگ کی کتابیں لکھیں (۱۳) محمد ابن شیخ زین الدین محمد
خوش گو شاعر تھے۔ فرہنگ اسکندری فارسی لغت جو سلطان سکندر لودی
کے نام معنون کی گئی۔ آپ کی یادگار ہے۔

خاندانِ مغلیہ

ظہیر الدین محمد بابر | ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے مقام پر سلطان ابراہیم
لودی اور بابر میں ہندوستان کی سلطنت کے لئے جنگ ہوئی۔ اور
ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا علم بلند کر دیا گیا۔ بابر صرف ایک جری
سپاہی اور تجربہ کار جنرل ہی نہ تھا بلکہ ایک نازک مزاج شاعر بھی تھا
قدرتی مناظر کا بہت دلدادہ تھا۔ اس کی شاعرانہ طبیعت نے آگرہ میں
بھی چار چمن لگا کر مطالعہ حسن کے مواقع مہیا کر لئے تھے۔ ترکی کا بلند
پایہ شاعر تھا۔ تزک بابری اس کی انشا۔ اور ادب کا بہترین نمونہ ہے۔
فارسی میں بھی شعر کہتا تھا۔ اس نے فارسی شعرا، حافظ، سعدی اور جامی
کی تقلید میں غزلیں وغیرہ لکھیں ہیں۔ اس کی فارسی بدیہہ گوئی کی بہت
سی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔

بابر کی ہندوستان کی زندگی بہت مختصر تھی۔ اور اس عرصہ میں بھی
اس کو سلطنت کے استحکام سے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ علوم و فنون کی طرف
توجہ کرتا۔ پھر بھی اس کے دربار کے متوسلین میں سے چند کے نام درج
کئے جاتے ہیں۔ (۱) آتش قندھاری یہ بچپن میں ہندوستان آیا اور

لاہور میں مقیم ہوا۔ بابر کی حکومت قائم ہوجانے کے بعد پرچہ نویسی کی خدمت پر مامور ہوا۔ اور ترقی کر کے اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا۔ شاعر بھی تھا اور اچھا کہتا تھا۔ (۲) شیخ محمد غوث گوالیاری ایک بڑے بزرگ اور بلند مرتبہ صوفی تھے۔ بابر ان کا بے حد احترام اور عزت کرتا تھا۔ گوشہ نشین تھے۔ تصوف پر ان کی چند قابل قدر تصانیف ہیں۔ رسالہ غوثیہ، جواہر الخمسہ

اور گلزار ابرار تذکرہ صوفیائے ہند۔ شعر بھی کہتے تھے۔ تصوف کے دقیق مسائل نہایت خوبی سے نظم کئے ہیں (۱۵۶۲ء) میں انتقال فرمایا۔ (۳) شیخ زین الدین وفائی بڑے اعلیٰ درجہ کے منشی اور انشا پرداز تھے۔ بابر نے ان کی ادبی لیاقت کی تعریف کی ہے۔ تزکِ بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ شاعر بھی تھے۔ آپ نے رباعیات میں مضامین اخلاق بڑی خوبی سے ادا کئے ہیں۔

نصیر الدین محمد ہمایوں ہمایوں کی مادری زبان ترکی تھی اور بظاہر یہی سمجھا جائے گا کہ اس نے ترکی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اس کو ترکی سے زیادہ فارسی سے شغف تھا۔ اور اس امر کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ وہ بجی گفتگو میں ترکی کی جگہ فارسی بولتا تھا۔ اس کے علاوہ شاعر تھا۔ ہمایوں تخلص تھا۔ ایک ضخیم دیوان اس کی یادگار ہے۔ ایک مثنوی فتح قندھار کے متعلق لکھی۔ اس کے اشعار اگرچہ سادہ ہیں۔ لیکن ایک خاص شیرینی اور روانی پائی جاتی ہے۔ طرز ادا صاف ہے۔ سلیس اور کم الفاظ میں عمدہ مضامین بیان کرتا ہے۔ عربی بھی جانتا تھا۔ علوم ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور نجوم سے شوق تھا۔ اور سب کو سبقاً سبقاً پڑھ کر حاصل کیا تھا۔ اس کے عہد کے شعرا اور مصنفین کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

(۱) شیخ امان اللہ پانی پتی۔ صوفی منش بزرگ اور عالم تھے۔ دربار

ہمایوں کے خاص شاعر تھے۔ اُن کے قصائد معاصرین کے مقابلے میں سلیس ہوتے تھے۔ (۲) میر وصفی امرا درباریں سے تھے۔ خود شاعر تھے اور شعرا اور علما کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اپنے مکان پر مشاعرہ منعقد کر کے شعرا کو مدعو کرلیتے تھے۔ سخن پروری کے لحاظ سے ان کو ہمایوں کے دربار میں وہی رتبہ حاصل تھا۔ جو میر علی شیر کو سلطان حسین کے دربار میں یا خانخانان کو اکبر کے دربار میں (۳) مولانا جلالی ہندی درباری شاعر تھے۔ غزل زیادہ کہتے تھے۔ صنائع بدائع کے استعمال کا خاص شوق تھا (۴) محمد ابن اشرف الحسینی علم جمادات کے ماہر تھے۔ جواہرات کی ماہیت کے متعلق ایک کتاب جواہر نامہ ہمایونی اُن کی یادگار ہے۔ جو بابر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی اور ہمایوں کے نام معنون کی گئی۔ (۵) مولانا نادری سمرقندی، سمرقند سے آگرہ آئے۔ بڑے جید عالم تھے۔ شاعر بھی تھے۔ اور مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک قصیدہ میں ہمایوں کی سائنس سے دلچسپی کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ (۶) قاسم۔ درباری شعرا میں ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ ایک دیوان قصائد، مثنوی اور غزلیات پر مشتمل یادگار ہے۔ (۷) شیخ طاہر دکھنی، ہمایوں کی سلطنت کے دورِ اوّل کے مداحین میں تھے قصیدہ گوئی میں سلمان ساوجی اور ظہیر فاریابی کے مقلد تھے۔ آخر میں برہان نظام شاہ کے دربار میں چلے گئے۔ اور دکن میں شیعہ مذہب کی تبلیغ کی۔ (۸) شیخ عبدالواحد فارغی شیرازی۔ شیراز سے آگرہ آئے۔ دربار کے ممتاز شعرا میں شمار تھا صاحب دل صوفی تھے۔ غزلیات میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ (۹) یوسف بن محمد بابر کے طبیب خاص اور ہمایوں کے میر منشی تھے۔ یہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے قصیدہ میں حفظانِ صحت کے

اصول بیان کئے۔ اہم تصانیف یہ ہیں۔ (۱) ریاض الاشیا ماہیت ادویہ کے متعلق (۲) جامع الفوائد ادویہ کے خواص کے بارے میں (۳) قصیدہ فی حفظ الصحت (۴) جوامع الانشاء۔ انشا پردازی پر ایک مبسوط کتاب۔ (۱۰) جوہر ہمایوں کا خادم خاص تھا۔ جو جلاوطنی کی زندگی میں اس کے ساتھ تھا۔ اس زمانہ کے حالات نہایت دیانتداری سے قلم بند کئے ہیں۔ اگرچہ یہ ادبی حیثیت سے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی لیکن تاریخی اعتبار سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہے (۱۱) ضمیری ہمایوں کی سلطنت کے دورِ ثانی کا شاعر تھا۔ قصائد کے علاوہ پانچ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ (۱) وامق و عذرا (۲) نازونیاز (۳) افسانۂ بہار وخزاں (۴) سرگذشتِ مجنوں (۵) سکندرنامہ۔ (۱۲) گلبدن بیگم ہمشیرہ ہمایوں عالمہ اور فاضلہ تھی۔ ترکی اور فارسی زبانوں پر کافی دستگاہ رکھتی تھی۔ ہمایوں نامہ اس کی تصنیف ہے۔

جلال الدین محمد اکبر

سلطنتِ مغلیہ کا سب سے خوش نصیب تاجدار جلال الدین محمد اکبر اگرچہ اُمّی تھا لیکن اُس کے گرد و پیش اس قدر علماء اور اہلِ فن جمع تھے کہ محض ذکاوتِ طبع اور فیضِ صحبت نے اُس کو اچھا خاصہ عالم بنا دیا تھا۔ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا۔ علماء کے مباحث کو بڑی دلچسپی سے سنتا اور ان میں شریک ہوتا۔ شعر سے خاص شغف تھا۔ دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار اس کو زبانی یاد تھے۔ جن کا برمحل استعمال کرتا تھا۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق خود بھی شاعر تھا۔ ابوالفضل نے اُس کے اشعار، قطعات اور بدیہہ گوئی کے نمونے بھی درج کئے ہیں۔ صحیح کہ بحیثیتِ شاعر کے ہم اس کو کوئی منصب نہیں عطا کر سکتے۔ لیکن اس کے دربار میں اس قدر اہلِ کمال کی کثرت تھی اور وہ اس درجہ دریا دلی سے اُن کی خاطر کرتا تھا کہ یہ خود ایک بڑی خدمت ہے۔ امراء دربار

بھی سخن پروری میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔
اور یہی اسباب تھے کہ ایران کے دربار صفوی میں صرف معدودے
چند فضلا نظر آتے ہیں۔ دور و دراز مسافت، منزل کی صعوبتیں، غربت
کی تکالیف، سب کچھ اُن کو گوارا تھا۔ اس لئے کہ بادشاہ اور امرار
دولت کے درباروں میں سونے چاندی کا مینہ برستا تھا۔

اب ہم ان شعرار اور مصنفین کا ذکر کریں گے جو اُس کے یا اُس کے
امرار کے دربار سے وابستہ تھے۔ (۱) فیضی ابن شیخ مبارک عالم متبحر
تھا۔ ایران کے متعصب اور تنگ نظر شعرار اور علمار تک نے بھی اس کی
قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ دربار اکبری سے ملک الشعرار کا خطاب

ملا تھا۔ عربی اور فارسی میں اس کی ایک سو ایک تصانیف بتائی جاتی
ہیں۔ (بدالونی) قرآن شریف کی بے نقط تفسیر لکھی۔ بادشاہ کے اصرار
سے خمسۂ نظامی کا جواب لکھا۔ (۱) مرکز ادوار (۲) سلیمان و بلقیس
(۳) نل دمن (۴) ہفت کشور (۵) اکبر نامہ، مقاصد الشعراء کے نام
سے تذکرہ شعرار بھی لکھنا شروع کیا تھا مگر تمام نہ ہو سکا۔ ۱۵۹۵ء میں
انتقال کیا۔ (۲) نظیری نیشاپوری اپنے وطن سے کاشان آیا۔ وہاں
کچھ دنوں قیام کر کے خانخانان کے دربار میں آیا۔ اور اسی کی سفارش
سے اکبر کے دربار میں باریابی حاصل کی۔ لیکن چمک نہ سکا۔ جہانگیر
کے عہد میں اس کا ستارہ چمکا اور انعام و اکرام سے سرفراز ہوا۔
غزل کا شاعر تھا۔ تصوف کا رنگ غالب تھا۔ حافظ کے طرز کا دلدادہ
تھا آخر ۱۵۹۴ء میں دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا تھا۔
(۳) جمال الدین محمد عرفی شیراز کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد سرکاری
عہدہ دار تھے۔ ہندوستانی درباروں کی شہرت سن کر یہاں آیا۔ فیضی

کے پاس کچھ دنوں رہا۔ مگر کسی بات پر ناچاقی ہو گئی۔ اور حکیم ابوالفتح کے دامنِ دولت میں پناہ لی۔ اور اُن کے انتقال کے بعد خانخانان کے متوسلین میں شامل رہا۔ غزل کا استاد تھا۔ جوش سے بیان کرتا ہے اُس کے قصائد اگرچہ بہت زیادہ نہیں لیکن ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء میں ۳۶ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

(۴) ابوالفضل علامی اکبر کے نہایت معتمد امرا میں تھا۔ شیخ مبارک کا خلف الرشید اور فیضی کا چھوٹا بھائی تھا۔ شاعر اور عالم اور مؤرخ تھا۔ اکبر نامہ آئینِ اکبری، انشائے ابوالفضل اور عیارِ دانش اس کی تصنیفات ہیں۔ انشائے ابوالفضل کی عبارت نہایت مشکل اور گنجلک ہے۔ مرادفات کی کثرت اور تکرار کی شدت نے اور دقیق بنا دیا ہے۔ آئینِ اکبری میں خالص فارسی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عیارِ دانش کی عبارت ان سب سے جدا اور سہل ہے۔ ۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء میں جہانگیر کے ایما سے نرسنگھ دیو نے قتل کرا دیا۔

(۵) بیرم خاں اکبر کا اتالیق تھا۔ اس کے قصائد و غزلیات کا دیوان مشہور ہے۔ (۶) عبدالرحیم خانخانان معتمد امرا میں سے تھا۔ اس کا دربار شعرا کا مرجع تھا۔ شعر سے فطری مناسبت تھی۔ صاحب دیوان شاعر تھا۔ ایک بیش بہا کتب خانہ احمد آباد میں آج تک اس کی یادگار ہے۔ فارسی ادب میں اُس نے جو اضافے کئے وہ بیش بہا ہیں۔ (۷) حکیم ابوالفتح گیلانی بھی خانخانان کی طرح شعرا کی بیحد قدر کرتا تھا۔ اور ایک گروہ اس کے خوانِ نعمت سے مستفید ہوتا تھا۔ عرفی اور حیاتی تو گویا اسی کے پروردہ تھے۔ ہندوستان کا جدید رنگِ تغزل اسی کا فیضان تھا۔ اسی طرح نثر میں سادگی کو بھی اسی نے رواج دیا۔ رقعات چار باغ از ابوالفتح اس رنگ کی بہترین کتاب ہے۔ (۸) خان زمان بھی امرائے اکبر میں سے تھا اور سخن پروری میں کسی سے کم نہ تھا۔ صاحبِ صنادید عجم کا بیان ہے کہ غزالی کو دکن سے ایک ہزار روپیہ

زادِ راہ بھجوا کر بلایا اور مثنوی نقش بدیع کے ہر شعر کے صلہ میں ایک اشرفی انعام دی (۹) الفتی یزدی بھی اسی کا ملازم تھا۔ (۱۰) غزالی مشہدی اکبر کے دربار کا شاعر تھا۔ نہایت خوش گو اور شیوا بیان تھا۔ ابوالفضل نے اس کے بارے میں لکھا ہے "بہ بلند فہمی و شیوا بیانی طرز یکتائی داشت و از دلا ویز گفتار صوفیہ بہرہ مند" اس کی شہرت کا اصل باعث مثنوی نقش بدیع ہے۔ ایک اور مثنوی اسرار المکتوم بھی لکھی تھی۔ (۱۱) حرفی اصفہانی اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔ فن شعر پر عبور حاصل تھا۔ کلام میں درد پایا جاتا ہے۔ اور کیفیات عشق سے لبریز ہے۔ (۱۲) خواجہ حسین ثنائی مشہدی وطن میں زراعت پیشہ تھا۔ شعر سے فطری مناسبت تھی۔ جب طبیعت میں جوش آیا تو دربار اکبری میں پہنچا۔ شاعری میں اس کی طبیعت جدت پسند تھی۔

(۱۳) ملا عبدالقادر بدایونی (۱۵۹۵ء) شیخ مبارک کے شاگرد تھے اکبر کے پیش امام تھے۔ زبان اور قلم پر پوری قدرت حاصل تھی مہابھارت کے بہت سے حصوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ منتخب التواریخ جس میں اکبر کے زمانہ کے حالات نہایت تفصیل سے ہیں۔ ایک نہایت مستند تاریخ کی کتاب ہے۔ اور انگریزی اور ہندوستانی مورخین کی تحقیقات متعلقہ دور اکبری کا بلا استثنا ماخذ ہے۔ اس کتاب کی زبان بہت سلیس اور صاف ہے۔

(۱۴) ملا ملک قمی۔ ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ علم اور شعر کے میدان میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فیضی نے اس کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ ایک ضخیم کلیات اُن کی یادگار ہے۔ اشعار میں معنی کم اور اور الفاظ عمدہ اور زیادہ ہیں۔ تشبیہیں سادہ و پرکار ہیں۔

(۱۵) ظہوری ترشیزی دربار احمد نگر کا بلند پایہ شاعر اور ملک قمی کا داماد تھا ایک ساقی نامہ برہان شاہ کو نذر کیا اور انعام حاصل کیا۔ اس کا محسن اصلی

ابراہیم عادل شاہ تھا۔ یہ نثر کہ اپنے طرز اور عبارت کے لحاظ سے نہایت عجیب کتاب ہے۔ اس کی شہرت کی ذمہ دار ہے۔ ایک کلیات و قصائد اور ساقی نامہ اس کی یادگار ہیں

نورالدین محمد جہانگیر شعر و شاعری سے بچپن ہی سے شوق تھا۔ الک تاج و تخت ہو کر محفل سخن آراستہ کی اور شعرا کی بے حد قدر کی۔ طالب آملی اسی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ تزک میں جہانگیر نے اس کے چند شعر انتخاب کر کے نقل کئے ہیں۔ جس کے تعلق مولانا شبلی کی رائے ہے کہ شاید طالب خود بھی اس سے بہتر انتخاب نہ کر سکتا۔ اگرچہ جہانگیر کے کلام کا کوئی مجموعہ ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن تزک جہانگیری میں اس کی بدیہ گوئی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب ذوق اور صاحب فن تھا۔ دربار میں کسی نے جامی کا مصرعہ پڑھا تھا:- "ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید" پڑھا۔ اس نے برجستہ گرہ لگائی۔

ساغرے بر رُخ گلزار می باید کشید ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

اسی طرح ایک بار کسی نے یہ شعر پڑھا۔

بگذر تیغ از سر ما کشتگان عشق یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

آپ نے بھی اس زمین میں ایک شعر فی البدیہہ پڑھا۔

از من متاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

تزک جہانگیری کی عبارت نہایت سلیس اور شگفتہ ہے تاریخی اعتبار سے اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس لئے کہ جہانگیر نے اپنے تمام واقعات جن میں اس کی کمزوریاں بھی شامل ہیں۔ بے کم و کاست بیان کر دئے ہیں۔

جہانگیر کے دربار کے شعرا کا تذکرہ کرنے سے قبل نور جہاں کا نام لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ ایرانی نژاد خاتون بے پناہ ذہانت اور ذکاوت

کی مالک تھی۔ طبیعت موزوں تھی۔ شعر وسخن سے خاص دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتی تھی اور شعرا و مصنفین کی قدر کرتی تھی۔ طرح کے مصرعے دے کر غزلیں لکھواتی اور انعام واکرام سے سرفراز کرتی تھی۔ طالب آملی پر خاص نظر تھی۔ ذہانت اور موزونیٔ طبع کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ عید کا چاند دیکھ کر جہانگیر نے کہا۔ ع۔ "ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد" نور جہاں نے برجستہ دوسرا مصرعہ پڑھا "کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد"۔ اور مثالیں بھی موجود ہیں۔

(۱) طالب آملی آغاز شباب میں ہندوستان آیا۔ تلاش معاش میں سرگرداں رہا۔ پھر مرزا غازی خاں والیٔ قندھار کے مقربان خاص میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اعتماد الدولہ تک رسوخ حاصل کیا اور اسی کے ذریعہ جہانگیر کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا۔

(۲) قاسم خاں جوینی (۳) میر محمد حسین شوقی اور (۴) میرزا جلال اسیر کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

شاہجہاں شاہجہاں بھی سخن پروری اور علم دوستی میں کسی سے کم نہ تھا۔ کلیم، رفیع قزوینی، دانش مشہدی وغیرہ خاص اسی کے دربار کے فیض یافتہ تھے (۱) شیدا اسئے مشہدی کے آباد اجداد ایرانی تھے۔ خود فتح پور سیکری میں پیدا ہوا۔ اور جہانگیر کی فوج میں داخل ہوا۔ بحیثیت شاعر کے شاہجہاں کے عہد میں عروج حاصل ہوا۔ ایک دیوان یادگار چھوڑا جس میں ایک لاکھ شعر ہیں۔ طبیعت مشکل پسند تھی۔ سنگلاخ زمینوں میں، و رمشکل قوافی کے ساتھ غزلیں کثرت سے کہی ہیں۔ مگر اکثر صاف ہیں۔ ۱۶۵۹ء میں وفات پائی۔ (۲) مرزا محمد علی صائب جہانگیر کے آخری زمانہ میں ہندوستان آیا۔ اور ظفر خاں والیٔ کشمیر سے ملاقات ہوئی اور اس کے ساتھ رہنے لگا۔ جب ظفر خاں دارالسلطنت آیا۔ تو صائب بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس طرح دربار

میں جگہ پائی ۱۶۳۲ء میں ظفر خاں کی مراجعت کشمیر کے بعد اصفہان گیا۔ وہاں دربار صفویہ میں بھی اس کی قدر ہوئی ۱۶۷۰ء میں انتقال کیا۔ غزل کا کوئی مضمون ہو حقیقت یا مجاز، فلسفہ یا رندی اسے ایک تمثیل کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ (۳) ابوطالب کلیم ہمدان وطن تھا۔ شیراز میں تحصیل علم کی جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا مگر ۱۶۱۸ء میں واپس چلا گیا۔ لیکن افسردہ اور بادل ناخواستہ، دو سال کے بعد پھر واپس آیا۔ اور میر جملہ کے ذریعہ سے شاہجہاں کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ بادشاہ کے ساتھ کشمیر گیا۔ اور یہ خطہ ایسا پسند آیا کہ وہیں رہ پڑا اور ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا۔ اس کے قصائد میں متانت اور بلندی کم اور تغزل زیادہ ہے۔ واقعہ نگاری سے دلچسپی تھی۔ اکثر واقعات کو نظم کیا ہے (۴) میر رضی دانش مشہدی داراشکوہ بن شاہجہاں سے خصوصیت تھی۔ آخر میں عبداللہ قطب شاہ کے پاس دکن چلا گیا۔ اسی کے ساتھ مشہد گیا اور وہیں ۱۶۶۲ میں انتقال کیا (۵) حاجی محمد جان مشہدی قدسی ۱۶۳۸ء میں ہندوستان آیا اور شاہجہاں کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ ۱۶۴۴ء میں انتقال کیا اور لاہور میں دفن ہوا۔ قصائد میں ایک خاص رنگ تھا۔ جو جدت تخیل کا رہین منت تھا۔ بعض قصائد میں بغیر تخلیص کے مدح شروع کر دیتا ہے۔ شاہجہاں کے حالات میں ایک مثنوی بادشاہ نامہ صاحبقراں ثانی لکھی ہے۔

محی الدین محمد اورنگزیب عالمگیر خود ایک جید عالم باعمل اور بے نظیر منشی تھا۔ رقعات عالمگیری اس کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو اس دور کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اگرچہ رنگ تحریر ابوالفضل سے ملتا ہے۔ لیکن بعید از قیاس استعارات، طویل اور گنجلک جملوں سے پاک اور سلاست اور روانی سے مزین ہے۔ چونکہ مدح سرائی سے اسے

نظری نفرت تھی۔ اس لئے درباری شاعر کا عہد ختم ہوا اور اس طرح شاعری پر زوال آگیا۔ رنگِ سخن جو شاہان گذشتہ کے فیض کرم سے پوری بہار پر تھا۔ خزاں دیدہ نظر آنے لگا۔ یوں خود اس کی لڑکی زیب النساء بیگم مخفی نہ صرف ایک بلند پایہ شاعرہ تھی۔ بلکہ اس کی سخن فہمی، اور شعر گوئی کے افسانے آج تک زبان زد خلایق ہیں۔ ایک دیوان بھی رائج ہے۔ جس میں زیادہ اشعار دوسرے شعراء خصوصاً مخفی اور رشتی کے ہیں میرزا محمد ابن حکیم محمد فتح الدین شیرازی۔ نعمت خاں عالی۔ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا۔ اور اورنگ زیب کے زمانے میں اول باورچی خانہ اور پھر جواہر خانہ کا داروغہ مقرر ہوا۔ اور مقرب خاں کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۷۰۹ء میں انتقال کیا۔ ایک مجموعہ قصائد وغزلیات اور وقائع نعمت خاں عالی جس میں اورنگ زیب کے محاربا دکن کا حال ہے، جنگ نامہ نعمت عالی جس میں معظم و اعظم شاہزادگان اورنگ زیب کی خانہ جنگی کا تذکرہ ہے اور مضحکات اسکی یادگار ہیں۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ دربار تقریباً ختم ہو گیا۔ اور گلشن سخن میں خزاں آگئی۔ اس زمانہ کے شعراء اور مصنفین ان امراء کے درباروں سے فیض یاب ہوتے جو مرکزی حکومت کے ختم ہونے کے بعد باقی رہ گئے تھے۔ (۱) ناصر علی سرہندی شروع میں سیف خاں صوبہ دار الہ آباد کی ملازمت میں رہا۔ اس کے بعد ذوالفقار خاں کی قدردانی سے مستفید ہوتا رہا۔ اس نے ایک مدحیہ غزل پر تیں ہزار روپیہ انعام دیئے۔ ۱۶۹۶ء میں انتقال کیا۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار چھوڑی۔ اس کے کلام میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی بے اعتدالی کی حد تک پائی جاتی ہے۔ استعارات کی کثرت ہے۔ سلاست اور برجستگی کی جگہ تصنع پیدا ہو گیا ہے۔ (۲) میرزا عبدالقادر عظیم آبادی، بیدل

عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ شاہزادہ محمد اعظم کے ملازم رہے۔ شاہزادہ
کی مدح میں قصیدہ لکھنے سے انکار کرکے ملازمت چھوڑ کر چلے آئے۔
اور دہلی میں گوشہ نشین ہو گئے۔ کلام میں جدید استعارے اور نئے تصرفات
کثرت سے ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ طرز ادا
نہایت پیچیدہ ہے۔ استعارات کی کثرت سے اکثر کلام معمّا ہو کر رہ گیا ہے۔
اس کے باوجود ان کا یہ احسان مسلّم ہے کہ انھوں نے شاعری کو معاملہ بندی
سے پاک کرکے تصوف اور حقیقت سے روشناس کیا (۲) شیخ محمد علی حزین
سنہ ۱۶۹۱ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ فن شعر سے فطری مناسبت تھی۔ نادر شاہ
کے حملہ کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور اپنی سوانح عمری یہیں تحریر کی۔
لاہور اور دہلی رہے۔ اور آخر بنارس گئے اور وہیں زندگی بسر کی۔ سنہ ۱۷۹۳ء
میں انتقال کیا۔ نثر سادہ اور دلکش ہے بے جا لفاظی اور رنگینی نہیں ہے
استعارات اور تشبیہات کا استعمال بھی کم ہے اور جہاں ہے۔ بہت خوبصورت۔
نظم میں اپنے زمانہ کے امام ہیں ہر صنف میں مذاق بلند کرنے کی کوشش
کی ہے۔ (۴) سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی سنہ ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوئے۔
۱۴ سال کی عمر سے شعر کہتے تھے۔ فرخ سیر کے عہد میں گوالیار میں خدمات
شاہی پر مامور رہے۔ فاضل اجل اور شاعر بے بدل تھے۔ تصنیفات کثرت

سے ہیں۔ فن معانی پر رسالہ موہبت عظمیٰ۔ عطیہ کبریٰ فن بیان میں سراج اللغۃ
شرح سکندر نامہ، شرح قصائد عرفی اور خیابان تذکرہ شعرائے فارسی۔ (۵)
مرزا مظہر جانجاناں بڑے بلند مرتبہ صوفی اور متوکل بزرگ تھے۔ شعر بھی کہتے تھے
واردات قلبی اور مسائل تصوف اشعار میں نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں (۶)
اسی زمانہ میں ایک اور بزرگ حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی بھی تھے۔ آپ
اپنے عہد کے ولی کامل اور صوفی باصفا تھے۔ رسالہ شمس العین تصوف پر آپ کی

ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ آپ نے مسئلہ وحدت الوجود اشعار میں وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (۷) غنی کاشمیری غزل گو شاعر اور صوفی صافی تھے۔ صائب کے تمثیلی رنگ کو کامیابی کے ساتھ نبایا ہے۔ اُن کے اس مشہور شعر پر

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

پر آج بھی سخن سنج سر دھنتے ہیں۔

(۸) میر عبد الجلیل بلگرامی عہد فرخ سیر کے مہر تاباں اور سرزمین بلگرام کے لعل بے بہا ایک جید عالم اور بلند پایہ شاعر تھے۔ (۹) غلام علی آزاد نہ صرف ایک زبردست عالم اور شاعر تھے بلکہ ایک اعلیٰ مصنف بھی تھے۔ مآثر الکرام اور سرو آزاد شعرائے فارسی کا تذکرہ اُن کی یادگار ہیں۔

اس زمانہ میں اکثر تصنیفات اور خصوصاً مذہبی اور فنی کتب فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں۔ اور ہر شاعر خواہ اس کا میدان اصلی ریختہ ہو فارسی میں ضرور کہتا تھا۔ کتب تواریخ بھی کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً مآثر الامراء، شاہ جہاں نامہ عبد الحمید اور سیر المتاخرین نیز مدارج النبوۃ اور معارج النبوۃ سیرت میں اور طبقات الانوار، جواہر عبقریہ علم کلام میں اس دور کی خاص تصنیفات ہیں۔

(۱۰) مرزا اسد اللہ خاں غالب ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار کے متوسلین میں رہے۔ نواب وزیر اودھ بھی قدردان تھے۔ نواب صاحب رام پور شاگرد بھی تھے۔ اور مالی امداد بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سرکار انگریزی سے بھی پنشن ملتی تھی۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا فارسی میں حسب ذیل تصنیفات ہیں۔

(۱) دستنبو (۲) قاطع برہان (۳) پنج آہنگ (۴) مہر نیم روز تاریخ سلاطین

دہلی از تیمور تا ہمایوں (۵) دیوان غزلیات و قصائد۔

(۱۱) مرزا قتیل اسی زمانہ کے ایک عمدہ شاعر تھے۔ (۱۲) واقف بٹالوی صاحب دیوان شاعر اور مصنف تھے۔

(۱۳) اس دور کو ہم ہندوستان میں فارسی شاعری کے آخری امام اور اسلامی تصوف اور فلسفہ کے علم بردار شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال کے تذکرہ پر ختم کرتے ہیں۔ آپ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے لاہور میں تعلیم حاصل کر کے وہیں کالج میں پروفیسر ہوئے۔ پھر لندن اور جرمنی حصول علم کے لئے گئے۔ اور واپس آکر خدمت ملک میں مصروف ہو گئے۔ مولانا روم کے مقلد تھے۔ مشرقی اور مغربی فلسفہ پر عبور تام حاصل تھا۔ خودی کی پرورش ان کا پیغام تھا۔ اور خودی کو پابند اسلام رکھنا ان کے نزدیک تکملہ حیات، عمل زندگی کی علامت اور بے عملی روح کی موت، فارسی میں زبور عجم، پیام مشرق اسرار خودی، رموز بے خودی، جاوید نامہ اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مشہور تصنیفات ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ اور ہندوستان میں مستند فارسی گوئی کا خاتمہ کر گئے۔

---

(۱۱)

دور صفویہ

(۱۵۰۲ — ۱۷۹۶)

شاہ اسمٰعیل صفوی نے ۱۵۰۲ء میں شرر کے مقام پر خاندانِ آق قوینلو کے آخری تاجدار کو شکست دے کر خاندانِ صفویہ کی بنیاد ڈالی۔ اور تبریز میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ چونکہ اسمٰعیل شیعہ تھا۔ اس لئے اس نے ملک میں مذہب

شیعی کی تبلیغ تلوار کے زور سے شروع کی۔ سب سے پہلے اعلان کیا کہ حکومت کا مذہب شیعہ ہے۔ اور رعایا کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے۔ اس حکم کی پابندی نہایت سختی سے کرائی گئی۔ تمام اُن سُنیوں کو نہایت

بیدردی سے قتل کرا دیا گیا۔ جنھوں نے شیعہ مذہب قبول کرنے سے انکار کر دیا (مآثر الامرار) ساتھ ہی اپنے مخالفین کا بھی استیصال کیا۔ اور جلد ہی سلطنت کو مستحکم بنا دیا۔ (۱) زلالی خوانساری۔ اس کے دربار کا ملک الشعرار تھا۔ (۲) حکیم شرف الدین حسن شفائیؔ بھی اسی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اُس نے ایک مثنوی نمکدانِ حقیقت۔ حدیقۂ سنائی کی بحر میں لکھی۔ ایک دیوان غزلیات کا بھی مرتب کیا۔ اسمعٰیل نے ۲۲ سال سلطنت کرنے کے بعد ۱۵۲۴ء میں وفات پائی۔ اور شاہ طہماسپ وارثِ سلطنت ہوا۔ اس نے ۱۵۲۴ء سے ۱۵۷۶ء تک سلطنت کی۔ اس کے دربار کے شعرا یہ ہیں (۱) وحشیؔ کرمانی ایک رند مشرب شاعر تھا۔ شراب و شاہد کا دلدادہ، غزلیات میں مضامین عشق نہایت جوش کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ قصائد بھی لکھے ہیں۔ مگر اُن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ کام اس سے جبریہ لیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ تین مثنویاں خلد بریں ناظر و منظور اور فرہاد و شیریں بھی اس کی یادگار ہیں۔ آخر الذکر مکمل نہ ہو سکی۔ (۲) ولی دشت بیاضی غزل کا شاعر تھا۔ اور اچھا کہتا تھا۔ (۳) ملّا محتشمؔ کاشی شاہ کے دربار میں اس کو بڑا اعزاز حاصل تھا۔ ابتدائی زندگی عشق بازی میں گزری ہے۔ اور جلالیہ و نقل عاشق میں اپنے حالاتِ عشق نظم و نثر میں لکھے ہیں (آتشکدہ) غزلیں اور قصیدے پھیکے ہیں۔ البتہ مرثیہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اس دور کے بہترین مرثیہ گو تھے (۴) شرف جہاں قزوینی غزل گو تھا۔

شاہ طہماسپ کے انتقال کے بعد اسمعٰیل دوم تخت نشین ہوا لیکن ایک ہی

سال کے بعد نہایت بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ اور اس کا بڑا بھائی محمد خدابندہ

جو نہایت ضعیف اور اندھا تھا تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے دس برس تک حکومت کی اور ۱۵۸۵ء میں اس کی وفات کے بعد شاہ عباس اعظم جلوہ آرائے تخت ہوا۔ اس نے ۴۲ برس تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی حقیقت میں اس کا زمانہ حکومت دور صفویہ کا عہد زریں ہے۔ تاریخ کا یہ عجیب اتفاق بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کی بڑی حکومتوں پر ایسی ہستیاں متمکن تھیں جو تاریخ کے صفحات کو اپنے کارناموں سے مزین کر گئیں انگلستان میں ملکہ الزبتھ جس کے عہد میں انگلستان میں ملٹن اور شیکسپیئر جیسے شاعر اور ڈاکٹر جانسن جیسے نقاد ہوئے اور ہندوستان میں اکبر اعظم کی علم دوستی کا تذکرہ آپ دور ہندیہ میں دیکھ چکے ہیں اگرچہ سلطنت کے استحکام کا کام طہماسپ ہی کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ لیکن صنعت و حرفت اور علوم و فنون کی جو ترقی شاہ عباس کے زمانہ میں ہوئی اس سے قبل کبھی نہ ہوئی تھی۔ رعایا خوش حال تھی۔ ملک میں امن و امان تھا۔ معابد و مقابر کی حفاظت کی گئی۔ اس شاہ علم پرور کے خوان کرم سے بے شمار علما و فضلا شعرا اور مصنفین بہرہ مند ہوئے۔ اکرام و انعام کی جو بارش اس زمانہ میں ہوئی وہ اگرچہ سلاطین ہند کے مقابلہ میں نہیں پیش کی جا سکتی۔ مگر دور صفویہ میں اس کی کوئی دوسری نظیر بھی نہیں مل سکتی۔ ہم وابستگان دامن دولت میں سے چند کے نام درج کرتے ہیں۔ (۱) سیابی استر آبادی جو جائی الاصل تھا۔ شوستر میں پیدا ہوا۔ رباعی گو شعرا میں اس کا مرتبہ نہایت بلند ہے

اس نے اپنی رباعیات میں مسئلہ جبر و اختیار اور مسائل اخلاق کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ (۲) شیخ بہاء الدین آملی شیخ الاسلام تھے۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ایک مثنوی نان و حلوا لکھی ہے۔ جس میں لذات دنیوی و روحانی کا موازنہ کیا ہے۔ نثر میں بھی بہت سی تصنیفات ہیں۔ جن میں جامع عباسی بہت مشہور ہے۔ (۳) شانی تکلو۔ دربار میں بڑا اعزاز حاصل تھا۔ شاہ کی

خاص نظر کرم تھی۔ ایک مرتبہ اس مطلع کو سن کر بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ شانی کے وزن کے برابر سونا عطا فرمایا ؎

اگر دشمن کشد ساغر و گر دوست　　بطاق ابروئے مستانۂ اوست

غزلیات میں عشق مجازی کا رنگ غالب ہے۔ (۴) مُلّا حسن کاشی۔ جس کا ہفت بند حضرت علیؓ کی منقبت میں آج تک مشہور ہے۔ (۵) اسکندر منشی صاحب تاریخ عالم آرائے عباسی؛ اس کے علاوہ شیعہ مذہب کی متعلق لاتعداد کتابیں اس زمانہ میں تصنیف ہوئیں اور مصنفین دربار شاہی میں انعام و اکرام سے سرفراز کئے گئے۔ اس شاہ ہنر پرور نے ۱۶۲۹ء میں انتقال کیا۔ اور اس کے بعد شاہ صفی (۱۶۴۲-۱۶۲۹) اور شاہ عباس دوم (۱۶۶۶-۱۶۴۲) تخت نشین ہوئے۔ طاہر وحید قزوینی اس کا معتمد تھا۔ علاوہ وقصائد کے دو مثنویاں لکھیں۔ جن میں سے ایک کا نام ناز و نیاز ہے۔ نثر میں خطوط کا مجموعہ انشائے طاہر وحید کے نام سے یادگار ہے۔ شاہ سلیمان (۱۶۹۴-۱۶۶۶) اور شاہ حسین (۱۷۲۲-۱۶۹۴) یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے۔ شاہ حسین کے بعد (۱۷۲۲ء)

آقا محمد قاچار کی تخت نشینی تک (۱۷۹۶) ایران میں ایک بدامنی اور طوائف الملوکی کی کیفیت رہی۔

افغانی عروج | قندھار کے افغانوں نے میرویس کی سرکردگی میں حکومت ایران کے خلاف بغاوت کی۔ میرویس کو اس بغاوت میں بڑی کامیابی ہوئی اور وہ افغانی اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۷۱۵ء میں میرویس کا انتقال ہوگیا۔ لیکن حکومت کے خلاف جنگ برابر جاری تھی۔ اس کے بیٹے میر محمود کے زمانہ میں حاکم ہرات، ابدالی افغان، ماوراءالنہر کے ازبک اور کرت اس کے شریک کار ہوگئے۔ اور اس دفعہ پوری تیاری کے ساتھ ایرانی حکومت کی مخالفت کی گئی۔ اور ۱۷۲۲ء میں گلناباد کے مقام

پر ایک فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ ایرانی حکومت کو شکست ہوئی اور اسی سال شاہ حسین صفوی نے تاج و تخت افغانی سردار میر محمودؒ کے حوالہ کر دیا۔ ۱۷۲۵ء میں اشرف خاں نے سردار محمودؒ کو قتل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اور صفوی خطرہ سے مطمئن ہونے کے لئے ۱۷۲۸ء میں سلطان شاہ حسین کو قتل کرا دیا۔ لیکن دو ہی برس کے بعد ۱۷۳۰ء میں نادر خاں افشار نے اس کو شکست دے کر افغانی اقتدار کو ختم کر دیا۔

نادر شاہ (۱۷۳۰-۱۷۴۷)

۱۷۲۷ء میں پہلی بار نادر شاہ اپنے قلعہ سے نکل کر افغانوں سے نبرد آزما ہوا۔ اور ان کو شکست دی۔ اس کے بعد وہ طہماسپ ثانی ابن شاہ حسین کے دربار میں حاضر ہوا اور اس قدر رسوخ حاصل کر لیا کہ شاہ کے وزیر اور معتمد فتح علی خاں قاچار کو قتل کر دینے میں کامیاب ہو گیا دربار کی طرف سے اطمینان کر کے شاہ طہماسپ ثانی کو ساتھ لے کر افغانوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ اور ۱۷۳۰ء میں ان کا قلع قمع کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر ایران کی حکومت اپنے لڑکے رضا قلی خاں کے سپرد کر کے دو سال (۱۷۳۷-۱۷۳۹) ہندوستان کے حملوں میں مصروف رہا۔ وہاں سے واپسی پر اسے معلوم ہوا کہ اس کی عدم موجودگی میں رضا قلی خاں نے شاہ طہماسپ ثانی اور اس کے تمام خاندان کو قتل کرا دیا ہے۔ یہ واقعہ سن کر اسے شبہ ہوا کہ کہیں یہ قتل کسی بڑی سازش کا پیش خیمہ نہ ہو اس لئے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کا سد باب کر دیا۔ اس وقت سے ۱۷۴۷ء تک اسے چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اور بالآخر اسی سال چند سرداروں نے خیمہ میں گھس کر اسے قتل کر دیا۔ اس زمانہ میں مرزا مہدی خاں نے جہاں کشائے نادری تاریخ فتوحات نادر شاہ اور درۂ نادری تصنیف کیں۔ نادر شاہ کے بعد اس کا بھتیجا علی قلی خاں تخت پر بیٹھا اور عادل شاہ لقب اختیار کیا لیکن جلد ہی اپنے بھائی ابراہیم کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ۱۷۴۵ء میں یہ بھی

قتل کر دیا گیا۔ اور نادر شاہ کا پوتا۔ شاہ رخ تخت کا مالک ہوا۔ اگرچہ اسکو بار بار تخت سے اتارا گیا۔ لیکن مجموعی طور پر اس نے ۱۷۹۵ء تک حکومت کی۔

خاندان زند | کریم خاں بانئ خاندان زند اور علی مردان خاں سردار قبیلۂ بختیاری متحدہ طور پر جنوبی ایران پر حکومت کرتے تھے۔

بعد میں علی مردان خاں قتل کر دیا گیا۔ اور کریم خاں تنہا حکومت کا مالک ہوا کریم خاں کا سب سے بڑا مخالف ایک افغانی سردار آزاد تھا۔ شروع میں اس کو بڑی کامیابی ہوئی۔ لیکن آخر میں اس نے شکست قبول کر کے اپنے آپ کو کریم خاں کے حوالے کر دیا۔ اس موقع پر کریم خاں نے بے نظیر فراخدلی کا ثبوت دیا۔ بڑے اہتمام سے اس کا استقبال کیا اور بڑی عزت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کا ہی ہو رہا ۱۷۵۵ء میں کریم خاں کو محمد حسن خاں قاچار ولد فتح علی خاں قاچار کا مقابلہ کرنا پڑا اور بالآخر ۱۷۶۰ء میں محمد حسن خاں قتل کر دیا گیا۔ مخالفین سے میدان خالی ہو چکا تھا اور کریم خاں تنہا تقریباً تمام ایران کا مالک تھا۔

محمد حسن خاں کے قتل کے بعد آقا محمد خاں قاچار کو عادل شاہ نے خصی کر کے کریم خاں زند کی حراست میں دے دیا۔ ۱۷۷۹ء میں جب کریم خاں کا انتقال ہو گیا تو آقا محمد خاں قاچار فرار ہو کر مازندران پہنچا۔ اور خاندان زند کی بیخ کنی کی تدابیر کرنے لگا۔

حاجی لطف علی بیگ آذر صاحب تذکرۂ فارسی آتشکدہ کریم خاں کا مداح تھا۔ علاوہ مدحیہ قصاید کے ایک مثنوی یوسف زلیخا بھی تصنیف کی۔

کریم خاں کے انتقال کے بعد اس کے چار اعزا ابو الفتح، علی مراد، محمد علی اور صادق یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ علی مراد نے ۱۷۸۲ء میں صادق اور اس کے تمام بیٹوں کو علاوہ جعفر کے قتل کرا دیا۔ ۱۷۸۵ء میں

علی مراد کا انتقال ہوا اور جعفر خاں سلطنت کا مالک ہوا۔ لیکن ۱۷۸۹ء میں
وہ بھی قتل کرا دیا گیا۔ اور حکومت اس کے بیٹے لطف علی خاں کو حاصل ہوئی۔ اور
بالآخر آقا محمد خاں قاچار نے خاندان زند کا خاتمہ کر دیا۔

اس دور کے زیادہ مشہور شعرا اور مصنفین کا تذکرہ ان بادشاہوں
کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ جن کے دربار سے وہ وابستہ تھے ذیل میں
دوسرے شعرا اور مصنفین نیز علما عصر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) خوندمیر (۱۵۳۵) ابن میر خوند انھوں نے اپنے باپ کی مصنفہ تاریخ
روضۃ الصفا میں ساتویں جلد کا اضافہ کیا۔ حبیب السیر اور مکارم الاخلاق
اُنکی دوسری تصانیف ہیں (۲) بابا فغانی شیرازی (۱۵۱۹) (۳) عمادی طہرانی
(۱۵۲۵) (۴) فضولی بغدادی (۱۵۶۲) (۵) سام مرزا شاہ اسمٰعیل بانی خاندان
صفوی کے بیٹے تھے انھوں نے ایک تذکرہ شعرا تحفۂ سامی کے نام
سے ۱۵۵۰ء میں ترتیب دیا (۶) قیام الدین حیرت مصنف تذکرہ مقالات الشعرا
(۷) محمد طاہر نصیر آبادی مرتب تذکرہ الفراز (۸) محمد تقی خیال صاحب
بوستان خیال (۹) اہلی ترشیزی (۱۵۲۷) اہلی شیرازی (۱۵۳۵) (۱۱) ملا ظہیر سے
ترشیزی جن کی تصنیف شبنم شاداب نثر مرجز کا بہترین نمونہ اور اپنی وضع کی
منفرد کتاب ہے۔ گروہ علما میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ
تمام حضرات شاہان وقت کی طرف سے شیعہ مذہب کی ترویج اور اس کے
متعلق لٹریچر مہیا کرنے پر مامور تھے۔ اور اسی لئے شعرا سے زیادہ انعام و
اکرام پاتے تھے۔

(۱) نور الدین علی محقق ثانی (۱۵۳۴) (۲) احمد بن محمد مقدسی اردبیلی (۱۵۸۵)
(۳) میر محمد باقر داماد (۱۶۳۲) (۴) مصنف صراط المستقیم (۵) ملا محسن فیض
مصنف الواب الجنان (۱۶۴۵) (۶) ملا صدرا فلسفی (۷) ملا محمد تقی مجلسی
(۱۶۶۰) اور (۸) ملا محمد باقر مجلسی (۱۷۰۰) ان کی کثیر التعداد تصانیف میں سے

حق الیقین (۱۶۹۸) عین الحیات، مشکوۃ الانوار اور حیات القلوب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دور صفویہ کی ادبی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے ہمیں ان اسباب پر نظر ڈالنی ہے جو اس دور میں ادبی ترقی میں مانع ہوئے ہیں۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس زمانہ میں ایک مدت مدید ایسی گزری ہے کہ سارے ملک میں امن و امان تھا۔ ترقیات اور اصلاحات کا ایک زرین دور گزرا ہے کہ اس کا ذکر اکبر اعظم اور اس کے جانشینوں کے دور حکومت کے ساتھ کیا جاتا ہے اور علاوہ ان تاریخی شواہد کے جو اس زمانہ کی کتابوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہم آج بھی اس زمانہ کی خوبصورت اور شاندار عمارات دیکھ سکتے ہیں۔ جو اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ کہ شاہان صفویہ ہنر پرور تھے۔ اس کے علاوہ مصوری کے نہایت اعلیٰ نمونے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اگر فقدان ہے تو بلند مرتبہ شعراء کا۔ تاریخ ادبیات عجم کا طالب علم کس قدر حیرت سے دیکھتا ہے کہ دور تیموریہ کے ستر سال کے عرصہ میں کم از کم دس نہایت بلند مرتبہ شاعر آسانی کے ساتھ شمار کئے جا سکتے ہیں لیکن دور صفویہ کے دو سو بیس سال کے عرصہ میں صف اول کا ایک شاعر بھی نظر نہیں آتا ہے۔ برخلاف اس کے اسی زمانہ میں ہندوستان میں فیضی، عرفی، ظہوری، اور نظیری جیسے شعراء نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت کو تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے محسوس کیا ہے۔ مجمع الفصحا کے مصنف رضا قلی ہدایت نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ مرزا محمد خاں قزوینی نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "بے شبہ فارسی ادب و شاعری دور صفویہ میں انتہائی پستی میں جا پڑی تھی اور اس عہد میں کسی ایک شاعر کا بھی نام نہیں لیا جا سکتا جو صف اول کے شعراء میں شمار کیا جا سکے" ایک

مغربی مستشرق ڈاکٹر ایمتھے نے بھی اپنی کتاب فارسی شاعری میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اور پروفیسر براؤن نے بھی شعر و سخن کے اس حال پر بہت افسوس کیا ہے۔

اس کا کیا سبب تھا؟ اس سوال کا جواب صرف ایک جملہ میں دیا جا سکتا ہے۔ شاہان صفویہ نے اپنی تمام توجہ اور ذرائع کو مذہب شیعی کی ترویج میں بغیر اس خیال کے صرف کیا کہ اس طرح فارسی ادب و شعر کا گلشن تباہ و برباد ہو جائے گا۔ شاہان صفویہ اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر سلطنتِ عثمانیہ سے سخت برگشتہ اور سُنّی مذہب کے دشمن تھے۔ انھوں نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی دنیا کی ہر چیز پر سنیوں کی تباہی اور شیعہ مذہب کی ترویج کو ترجیح دی۔ اس کے مختلف اثرات ہوئے۔

سُنّی مذہب کی پشت پناہی بڑی حد تک صوفیائے کرام اور علماء خانقاہ نشین کرتے تھے۔ شیعیت کے زور میں ان حضرات کے ساتھ سخت سے سخت مظالم کیے گئے۔ خانقاہیں مسمار کر دی گئیں۔ صوفیائے کرام کو قتل کیا گیا، جلا وطن کیا گیا اور ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ ان کو زندہ جلایا گیا ہے (خط از مرزا محمد خاں قزوینی بنام پروفیسر براؤن مندرجہ تاریخ ادبیات ایران (براؤن) اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء اور صوفی شعراء کا وہ عظیم الشان گروہ جو تصوف، اور اخلاق کی تعلیم نظم و نثر سے دیتا تھا اور فارسی کے خزانہ ادب میں بیش بہا جواہر کا اضافہ کر رہا تھا۔ یکم قلم ختم ہو گیا۔ دوسرا فرقہ ان شعراء کا تھا جو شاہانِ وقت کی مدح سرائی کر کے کسب معاش کرتے تھے۔ اور دنیاوی ضروریات سے بے فکر ہو کر ادب و شعر کی خدمت میں عمر گزار دیتے تھے۔
شاہانِ صفویہ نے اسی مذہبی غلو میں ان لوگوں کو یہ حکم دیا کہ صرف

ایمہ کرامؑ کی شان میں قصیدے لکھے جائیں۔ ظاہر کہ اس حکم کے بعد انعام و اکرام کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ کس کی مجال تھی کہ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؑ کی منقبت بیان کرتا۔ اور صلہ کا امیدوار ہوتا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ معاش سے پریشان ہو کر ہندوستان کی طرف دوڑے جہاں بغیر کسی پابندی کے سیم و زر کی بارش ہو رہی تھی۔ ہاں اگر اس زمانہ میں کسی صنفِ شعر کو ترقی ہوئی

تو وہ مرثیہ ہے۔ محتشم کاشی کے مراثی زبان، طرز ادا، سوز و گداز، محاکات ہر اعتبار سے نہایت مکمل ہیں اور حقیقت میں یہ اس دور کے شاہکار کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے ادبی رجحانات کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس تین صدی کے عرصہ میں شعراء اور مصنفین نے متقدمین کی تقلید کی ہے۔ شاعری میں خاقانی، انوری اور معزی کا رنگ جھلکتا ہے اور نثر میں مقامات حمیدی اور تاریخ وصاف کا پرتو نظر آتا ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا شاید بے موقع نہیں کہ اس دور کے ہندی شعراء کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں ایک نئے طرز کی بنا ڈالی اور چونکہ یہ لوگ ایران سے دور اور مرکز زبان سے علیحدہ تھے۔ اس لئے ان کی زبان کی صحت پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس سے تو انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان میں آکر فارسی زبان میں ماحول کے اثر سے بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ہندوستانی اشیاء کے نام اور ہندوستانی ماحول سے حاصل کی ہوئی تشبیہات اور استعارات، زبان میں داخل ہوئے لیکن ہندوستانی مصنفین اور شعراء کا طرز بعینہ وہی ہے جو ایران کے شعراء اور مصنفین

کا ہے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ دورِ مغلیہ میں اتنے ہندی نژاد شاعر نہیں ہیں جتنے ایران سے معاشی تکالیف میں مبتلا ہو کر آئے تھے۔

اور چونکہ فیصلہ کثرت پر کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ یہاں باوجود مرکز زبان سے دوری کے چشمہ فیض وہی لوگ تھے جو اسی ارضِ مقدس سے آئے تھے۔ ہندوستان کے شاعروں کو درباری معرکوں میں بھی انھیں سے مقابلہ تھا۔ پھر کس طرح ممکن تھا کہ یہ کمتر طرزِ بیان اور گھٹیا زبان کے اوچھے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان شعر میں نبرد آزما ہوتے اور سُرخ روئی حاصل کر سکتے۔ ایرانی متعصب نقادوں نے ہندوستانی شعراء کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کی تردید خود اسی ملک کے دوسرے منصف مزاج نقادوں کی رائے سے ہو جاتی ہے۔ ہم ذیل میں بطور نمونہ دو ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس سے اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ معترض ناقدوں کی رائے حقیقت سے کس قدر دور ہے۔

مصنف آتشکدہ نے ظہوری کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا ہے "۔۔۔ مثنوی در بحر تقارب مشہور بہ ساقی نامہ گفتہ کہ در نظر فقیر حسن زیادہ نداز د ابالفصاحت مشہور شدہ"۔

اس کے مقابلے میں دیکھئے کہ علی قلی دالہ داغستانی نے کیا لکھا ہے:۔
"زباندانے مثل او ندیدہ سخنورے مانند وے نشنیدہ از فہم نزاکت بیانش ہر کس رانصیب نیست دازد قایق بلاغت کلامش ہر کوتہ اندیشے را حصہ (ریاض الشعراء)

صائب نے کہ خود ایک بلند مرتبہ شاعر تھا ظہوری کے متعلق لکھا ہے:۔
صائب نداشتیم سر و برگ این غزل این فیض از کلام ظہوری بما رسید

ابوطالب کلیم کے تعلق صاحب آتشکدہ نے لکھا ہے۔
"مدتے در ہمدان می بود غرض آخر الامر ہندوستان رفتہ، و سالہا در آنجا در خدمت شاہ جہاں بسر می بردہ۔ از ہر قسم شعر دارد لیکن در مثنوی و قصیدہ و رباعی شعرے کہ قابل باشد ندارد" لیکن مرزا علی قلی والہ داغستانی کی رائے ہے۔

" در عہد جہانگیر بادشاہ ہندوستان در ارود می بادشاہ بسر می کرد۔۔۔۔ تا آنکہ در زمان شاہجہاں ملک الشعرائے ہندوستان گردید اگرچہ در علوم کم پایہ است لیکن در شاعری قدرت تام داشتہ دا قسام شعر را خوب می گفتہ۔ ع "طور معنی بود روشن از کلیم" تاریخ وفات است"

اسی طرح فارسی شاعری کے امام صائب کے متعلق مجمع الفصحاء اور آتشکدہ میں جس بے انصافی سے کام لیا گیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے کیجئے۔

"۔۔۔ بارے در طریق شاعری طرزے غریب داشتہ۔ کہ اکنوں پسندیدہ نیست۔ با آنکہ صد ہزار بیت دیوان دارد ناچار بدیں چند بیت اکتفا رفت" (مجمع الفصحاء)

" در مراتب سخن گستری طرز خاصے دارد کہ شباہتے بفصحائے متقدمین ندارد با آنکہ با قصیدہ و رباعی میلے نداشتہ دیوانش قریب بیکصد ہزار بیت ملاحظہ شدہ و بعد از مراعات بسیار این چند بیت انتخاب شد" (آتش کدہ)

اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہندوستانی شعراء کے خلاف جو الزامات ہیں وہ سراسر تعصب پر مبنی ہیں۔ جن شعراء اور مصنفین کے عزز خاص طور پر ہدف ملامت بنائے گئے ہیں،

ہم انہی کے اسلوب پر لکھنے والے ایرانی باکمالوں کے نام گنا کر
کہہ سکتے ہیں کہ این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ ابوالفضل کے طرز
کا اندازہ آئینِ اکبری سے کرنا غلطی ہے۔ اس لئے کہ اس کتاب
کا مقصد اکبر اعظم کی سلطنت کا ایسا پروپیگنڈا تھا جو دوسرے کو
مرعوب کر سکے۔ اس لئے ہر طرح سے مبالغہ کیا گیا ہے۔ الفاظ
شاندار، تراکیب پیچیدہ، طرزِ بیان بلند آہنگ۔ سلطنت اور شاہ کا
ذکر مبالغہ آمیز۔ انشا اور عیارِ دانش کو دیکھئے کہ اس کا طرز بعینہ وہی
ہے۔ جو انشائے طاہر وحید اور اسکندر منشی کا ہے۔ اسی طرح، ہم
آخر دورِ مغلیہ میں رقعاتِ عالمگیر، دقائق نعمت خاں عالی اور تزک
جہانگیری، کو آتشکدہ، اور تحفۂ سامی کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔

---

(۱۲)

دورِ قاچاریہ

(۱۷۹۶ — ۱۹۰۵)

دورِ صفویہ کے بعد فارسی ادب و شعر میں ایک ایسا انقلاب ہوا کہ شاعری کے خد و خال تبدیل ہو گئے۔ اس کے دو سبب تھے ایک مغربی تہذیب و تمدن کا اثر دوسرے استبدادی حکومت سے اہل ایران کی بیزاری کی بنا پر جذباتِ حریت کی بیداری۔

دورِ قاچاریہ حقیقت میں ایک دورِ انقلاب ہے جس میں مغربی اثرات کے ماتحت تصنع اور لفظی صناعی اور معاملہ بندی سے تنفر پایا جاتا ہے۔ اور سعدی و نظامی اور رومی و فردوسی کی تقلید کی جانے لگی ہے۔

آقا محمد قاچار، بانی خاندان قاچاریہ اگرچہ ۱۷۷۹ء سے حکومت کر رہا تھا لیکن اس نے ۱۷۹۶ء میں باقاعدہ اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور ایران میں ایک مرکزی حکومت کی بنا ڈالی۔ ۱۷۹۷ء میں آقا محمد قاچار قتل ہوا اور اس کا بھتیجا فتح علی شاہ قاچار تخت پر بیٹھا دنیا کی تاریخ میں شاید یہ ایک ہی بادشاہ گزرا ہے۔ جس کے ۱۵۸ بیویاں اور تقریباً ۲ ہزار بیٹے پوتے تھے ۱۸۳۵ء میں اس کا پوتا محمد شاہ وارث تخت قرار دیا گیا۔ اس کے دور حکومت میں بابی مذہب کی تبلیغ

کا کام شروع ہوا۔ اس مذہب کا بانی سید علی محمد باب تھا۔ اس کے پیرو اس کو خدا آفریں اور اس کے خلفاء کو خدا مانتے تھے شاہانِ وقت نے بابی مذہب کے مقلدین پر طرح طرح کے ظلم کئے اور بالآخر ۱۸۵۰ء میں محمد علی باب قتل کر دیا گیا۔ اور ۱۸۴۸ء میں محمد شاہ قاچار کا انتقال ہوا۔ چونکہ شاہ کے انتقال کے وقت ولی عہد ناصر الدین شاہ موجود نہ تھا اس لئے عنانِ حکومت اُسکی والدہ نے سنبھالی۔ حاجی مرزا عہدہ وزارت سے برطرف کر دیا گیا۔ اسی سال میں ناصر الدین شاہ قاچار کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اور امیر نظام مرزا تقی خاں وزیر وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا اس زمانہ میں علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور نظم و نثر کی اعلیٰ تصنیفات شائع ہوئیں۔ ناصر الدین شاہ نے دو بار سفر یورپ کیا۔ اور ایران کی بین الاقوامی حثیت قایم کرنے کے لئے مختلف ممالک میں سفارت خانے کھولے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں تین شوریدہ سر بابیوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد مظفر الدین شاہ قاچار جانشین ہوا۔

ایرانی استبدادی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ حریت اور آزادی کے ترانوں سے ایران کی فضا گونج رہی تھی۔ سیاسی انقلاب کے لئے اندر ہی اندر مواد پک رہا تھا۔ ملک میں آزادی کی علم بردار جماعتیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ بالآخر وہ وقت آپہنچا کہ ۱۹۰۶ء میں مظفر الدین شاہ قاچار کو تخت سے اُتار دیا گیا اور ملک میں جمہوری حکومت قایم ہو گئی۔

اس دور کی خصوصیات کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ زمانہ فارسی شعر و ادب کے لئے انقلابی زمانہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ دورِ صفویہ میں "فارسی شاعری انتہائی پستی میں جا پڑی

تھی۔ اور اس کا انحطاط دور قاچاریہ سے قبل ہی مکمل ہو چکا تھا۔ اس لئے شعراء اور مصنفین نے پیش رو حضرات کا مسلک چھوڑ کر متقدمین کی تقلید کی "ان کی شاعری جذبات دلی اور واردات قلبی کی آئینہ دار تھی۔ جو دیکھتے یا جو دل پر گزرتی اس کو فطری زبان میں ادا کر دیتے تھے۔ تصنع، اور لفاظی الجھاؤ اور آورد کا نام نہ تھا جذبات اور احساسات فطری ہوتے تھے۔ تخیل کی ان دیکھی دنیا میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح کبھی بھٹکتے نہیں پھرے۔ حقیقت میں یہی صحیح راہ تھی۔ جس کو دور متوسطین کے شعراء نے چھوڑا۔ اور دور قاچار کے حضرات نے حقیقت کو سمجھ کر پھر اختیار کیا۔ سیاسی ماحول اور ملکی اثرات سے اس میں وطنیت، ایثار، اور آزادی کے جذبات کا اضافہ ہوا۔ یہ اعتراض کہ "دور قاچاریہ کی شاعری متقدمین کی نقالی ہے" ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ آپ کسی رند کی توبہ کو سن کر اس کے ایمان پر شبہ کی نگاہ رکھتے ہوں۔

ذیل میں ہم اس دور کے شعراء اور مصنفین کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ملک الشعراء فتح علی خاں صبا کاشانی (۱۸۲۲) فتح علی شاہ کے زمانہ کا سب سے ممتاز شاعر تھا۔ قصائد کے علاوہ مثنویاں شہنشاہ نامہ اور خداوند نامہ مشہور ہیں۔ (۲) میرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی (۱۸۲۸) بھی فتح علی شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ معتمد الدولہ خطاب تھا۔ کلام میں فصاحت اور شوخی پائی جاتی ہے۔ فلسفیانہ شاعری کا اس دور میں امام تھا۔ (۳) مرزا شفیع وصال شیرازی (۱۸۴۶) علاوہ شاعری کے اس کو خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا۔ قصائد و غزلیات کا ایک دیوان اور ایک مثنوی بزم وصال یادگار ہے (۴) میرزا ابوالحسن یغمائے جندقی ایک ہزل گو شاعر تھا۔ جس نے اپنی ذہانت اور

طباعی کا غلط استعمال کیا لیکن ایک مفید تصنیف، خطوط کا ایک مجموعہ ہے جو اس نے ذوالفقار علی خاں کے منشی کی حیثیت سے لکھے۔ ان کی زبان خالص فارسی ہے۔ اور بجید دلچسپ اور سلیس
(۵) نشاطی (۱۸۶۲) اس کے کلام میں ایک درد اور سوز پایا جاتا ہے اور فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ منقبت اہل بیت اکثر نظم کی ہے۔
(۶) میرزا حبیب اللہ حکیم قاآنی دور قاچاریہ کا مایہ ناز شاعر اور آسمانِ شاعری کا درخشندہ ستارہ، تھا۔ فتح علی شاہ قاچار نے مجتہد الشعراء کا خطاب عطا کیا۔ محمد شاہ قاچار نے حسان العجم کا لقب بخشا۔ اور ناصر الدین شاہ قاچار کے دربار میں ملک الشعراء کے معزز عہدہ پر سرفراز ہوا زبان اور بیان پر جو قدرت اس کو حاصل تھی، وہ اس دور میں کسی دوسرے کو نصیب نہ تھی۔ قصائد میں بلا کی سلاست روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ کسی قصیدے کو پڑھئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک بزم رود دریا ہے۔ کہ گاتا ہوا بہا چلا جا رہا ہے۔ اس نے گلستانِ سعدی کے جواب میں کتاب پریشان بھی لکھی (۷) سپہر کاشانی فتح علی شاہ اور محمد شاہ کے دربار سے وابستہ رہا ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانہ میں ایک ضخیم کتاب ناسخ التواریخ لکھی اور لسان الملک کا خطاب پایا۔ شاعر بھی تھا۔ کلام میں پختگی اور زور پایا جاتا ہے۔ زبان صاف اور شیریں ہے
(۸) طاہرہ بابیہ قرۃ العین کے لقب سے معروف ہے۔ محمد علی باب کی پیرو اور اس کے مذہب کی بہت بڑی مبلغہ تھی۔ عربی فارسی زبانوں پر دستگاہ رکھتی تھی۔ نہایت شیریں بیان اور جادو اثر خطیب تھی۔ شعر بھی بہت خوب کہتی تھی کلام میں جوش، روانی، برجستگی، سلاست اور اثر پایا جاتا ہے۔

بابیوں کے قتل عام میں یہ بھی تہ تیغ کی گئی۔

(۹) سامانی شیرازی بن حکیم قاآنی اپنے باپ کے قدم بقدم چلتا تھا۔ علاوہ عربی اور فارسی کے فرانسیسی زبان میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ بہار یہ نظمیں بہت عمدہ لکھی ہیں۔ عالم شباب میں (۱۸۸۵) میں انتقال کیا۔ (۱۰) رضا قلی خاں ہدایت (۱۸۷۲) ملک الشعراء صبا شیرازی کے انتقال کے بعد ملک الشعراء بنایا گیا۔ ناصرالدین شاہ کے حکم سے روضتہ الصفا میں دور صفویہ سے شاہ ناصرالدین تک کا حال شامل کیا۔ علاوہ متعدد مثنویوں کے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں، انوار الولایہ، گلستان ارم، بحرالحقائق، انیس العاشقین نثر میں فہرس التواریخ، تذکرہ ریاض العارفین، مجمع الفصحا، لطایف المعارف وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔ (۱۱) فتح علی شاہ قاچار خود شاعر تھا۔ اس کے مجموعہ کلام دیوان خاقان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام میں کافی پختگی تھی (۱۲) ناصرالدین شاہ قاچار بھی شاعر تھا۔ اس کی ممالک یورپ کی سیاحت کا حال سفرنامہ شاہ ایران ایک خاص شہرت کا مالک ہے۔ عبارت نہایت آسان اور صاف ہے۔ یہ کتاب اس لئے اور زیادہ قابل وقعت ہے کہ اس میں شاہ نے غیر زبانوں کے بہت سے الفاظ مفرس کرکے فارسی میں شامل کئے ہیں۔

(۱۳)

دورِ جدید

(۱۹۰۶ ـــــ ۱۹۴۷ء)

(۱۳)

دورِ جدید

(۱۹۰۶ — ۱۹۴۱)

ایران میں پہلا انقلاب جس کو تاریخ میں "دورِ مشروطہ اولیٰ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۵ر اگست کو رونما ہوا۔ استبدادی حکومت ختم ہوئی۔ جمہوریت کا آغاز ہوا۔ اور ۷ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو "مجلسِ شورائے ملی" قائم ہوئی۔ یہ قومی اور جمہوری حکومت ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء تک رہی۔ ملک میں دو جماعتیں تھیں۔ ایک قوم پرست۔ دوسری شاہ پرست۔ انقلابی دور تھا۔ شاہ پرست جماعت کے لوگ جمہوری غلبہ کے باوجود اپنی کوششوں سے غافل نہ تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر یہ لوگ محمد علیشاہ کو تخت نشین کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ مستبدانہ عہد ۲۳ر جون ۱۹۰۸ء سے ۱۶ر جولائی ۱۹۰۹ء تک رہا۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۰۹ء سے "مشروطہ ثانیہ" کا دور دورہ ہوا۔ اور مشروطیین کو فتح ملی حاصل ہوئی۔

مشروطی حکومت کو ابھی استحکام نصیب بھی نہ ہوا تھا کہ ۱۹۱۲ء کے آغاز میں روسی غلبہ کا دور شروع ہوا۔ اور تمام ایران میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اس زمانہ میں یورپ کی ہر طاقت ایران پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ چار سال عجیب سیاسی مصائب سے بھرے ہوئے تھے۔ تمام ملک میں امن و سکون مفقود تھا۔ جنگِ عظیم

کے اختتام کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کی مصیبت بھی کم ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں روسیوں نے ملکی انتشار سے فائدہ اُٹھا کر شمالی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت کرنل رضا خاں قزوین میں اپنی ایک مختصر فوج کے ساتھ مقیم تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ وطن خطرہ میں ہے تو تیزی کے ساتھ طہران کی طرف بڑھا اور ۲۳ر فروری سنہ ۱۹۲۱ء کو طہران پر قبضہ کر لیا۔ ملک نے رضا خاں کی قابلیت کو پہچانا اور جلد ہی ملکی تحفظ اور دفاع کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں دیدی۔ کچھ عرصہ تک "مجلس شورائے ملی" میں رضا خاں وزارتِ حرب اور وزارتِ عظمیٰ کے اہم عہدوں پر سرفراز رہے۔ اور جب ملک نے مختلف حیثیتوں سے اُن کی قابلیت اور اہلیت کا امتحان کر لیا تو بالآخر ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو تاجِ ایران اُن کے سپرد کر دیا۔ اور کرنل رضا خاں نے تخت نشین ہو کر رضا شاہ پہلوی لقب اختیار کیا۔ خلد اللہ ملکہ، وسلطنتہ،

رضا شاہ نے تخت نشین ہو کر ایران میں جو ذہنی انقلاب برپا کیا ہے اور جو اصلاحات کی ہیں۔ اُس کا تذکرہ شاید یہاں بے جا ہو۔ لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس انقلاب کا اثر ادبیاتِ ایران پر بھی پڑا ہے ایران کی پست اور درماندہ قوم کو ایک مدت کے بعد نتیجۂ استبداد سے اور قومی غداروں سے نجات ملی۔ اور آزادی کے ساتھ قومیت ایران کو اپنے خدوخال نمایاں کرنے کا موقع ملا۔ ترقی اور رفتارِ زمانہ کا قدم بقدم رہنا ہر قوم کی فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ ایران نے بھی مشرق و مغرب سے بہرہ تنے حاصل کرنی شروع کی جو ترقی کے لئے ممد و معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے ادبی سرمایہ میں علاوہ منظومات اور مصنفات کے اخبارات کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اور ایرانی انقلاب میں ان اخبارات کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے کہ ان کے ذریعہ سے پُر جوش نظمیں اور سیاسی مضامین ملک کے عرض و طول میں پہنچ جاتے تھے۔ اس زمانہ میں مشکل سے کوئی بڑا شہر ایسا ہوگا۔ جس سے کوئی اچھا اخبار نہ نکلتا ہو۔

انقلابی دور میں اہلِ ایران کو سیاسی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس لئے وطن پرستوں نے قانونی گرفت سے بچنے کے لئے غیر ملکوں سے اخبار شائع کرنے شروع کر دئے تھے۔ انھیں اخبارات نے ملک میں ایک نئی روح پھونکی۔ انہی اخبارات کے ذریعہ نئی علمی و فنی اصطلاحات اور جدید الفاظ کے گراں قدر سرمایہ کا اضافہ ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ایران میں سیاسی ادب کا سرمایہ؛ دلین انہی اخبارات کے بلند پایہ مقالات ہیں۔ ذیل میں ہم اہم اخبارات کا ذکر کرتے ہیں:-

غیر ملکی اخبار	قانون (لندن)، اختر (قسطنطنیہ) حبل المتین (کلکتہ) ثریا پرورش (قاہرہ)
ملکی اخبار	(طہران)، استقلال ایران، برق، بیداری، دانش، آفتاب روح القدس، زشت و زیبا، شرق، شرافت، مساوات روزنامۂ ملی

(اصفہان) پروانہ، جہاد اکبر، زاینده رود، فرہنگ، ناقور،

(مشہد) تازہ بہار، خراسان، خورشید، بہار، نو بہار، عصر جدید

(شیراز) نسیم شمال، گیلان، صدائے رشت، کنگاش، نوع بشر، مجاہد۔

اسی کے ساتھ ساتھ علمی، ادبی اور فنی رسائل کا بھی اجرا ہوا۔ ظاہر ہے کہ اخبارات صرف وقتی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسیات حاضرہ پر بحث و مباحثہ؛ واقعات تازہ پر نقد و تبصرہ اور ضروریات پیش نظر کے حل کا مطالبہ اُن کا کام ہوتا ہے۔ رسائل چونکہ نسبتاً بعید مدت کے بعد شائع ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں علمی، ادبی اور فنی مضامین کا بھی ایک گرانمایہ ذخیرہ ہوتا ہے۔ اور اُن کا نقد و تبصرہ اور بحث و مباحثہ بھی زیادہ دقت نظر اور مطالعہ عمیق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ موقر رسائل میں سے ہم چند کا یہاں ذکر کرتے ہیں:-

علمی اور ادبی:- مجلہ بہار، مجلہ ایران جوان، مجلہ مہر، مجلہ ایرانِ نو

مجلہ مجموعہ معارف، مجلہ نامہ تمدن، مجلہ تحفۃ الادبا

زنانہ رسائل:- مجلہ دختران ایران، اور مجلہ عالم نسواں

فنی اور تجارتی:- مجلہ اطاق تجارت، مجلہ فلاحت و تجارت، مجلہ علوم مالیہ و اقتصاد، مجلہ علم و ہنر

سرکاری محکموں کے جرائد:- مجلہ رسمی وزارت عدلیہ، مجلہ مذاکرات مجلس، مجلہ پست و تلگراف، مجلہ ثبت اسناد، مجلہ بانک ملی ایران

تاریخ عالم شاہد ہے کہ ملکی انقلابات میں شعراء نے ہمیشہ کافی حصہ لیا ہے فرانس کے انقلاب میں، اور انگلستان میں پارلیمنٹ اور بادشاہ کی کشمکش کے زمانہ میں شعرائنے جو اہم خدمات انجام دی ہیں۔ وہ آج تک تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ عرب کی بے نظیر شجاعت، اور یونان کی بے مثل جرأت کے کارنامے بڑی حد تک رزمیہ نظموں کے مرہون منت ہیں

ایران میں بھی بیسویں صدی کے شروع میں شعراء نے بے حس، ناکارہ، اور سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کا اہم کام انجام دیا۔ اس زمانہ کی نظمیں جوش، پیغام عمل، جذبات حریت، اور تاثرات قلبی سے لبریز ہیں۔ اس کے علاوہ اس عہد کی نظمیں ملک کی سیاسی حالت کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں۔ انقلابی دور میں ملک کے ہر گوشہ میں یہ نظمیں اخبارات کے ذریعہ سے پہنچ جاتی تھیں اور آن کی آن میں سارے میں آگ لگ جاتی تھی۔ اس قومی خدمت کے خاص علم بردار، نسیم شمال، گیلان، کنگاش، صدائے رشت، بہار، صور اسرافیل، اور ایران نو تھے۔ اور انقلابی شعراء میں ملک الشعراء بہار، سید اشرف رشتی، عارف قزوینی دہخدا، بدیع الزماں شیرازی، جعفر خمنائی، مرزا مرتضیٰ فرہنگ، ادیب نیشاپوری، حسین خان دانش، احمد سہیلی تبریزی، حسام الاسلام دانش پور داؤد، اور ملک ساسانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مرتب ادبیات ایران نو نے عصر حاضر کے شعراء کی تقسیم اس طرح

کی ہے"(۱) وہ جو اساتذۂ متقدمین منوچہری، فردوسی، سعدی، اور حافظ کے پیرو ہیں۔ اور تمام قدیم قواعدِ شعر کے سختی سے پابند ہیں۔

زمانہ کے اثرات کے ماتحت اُن کی شاعری حسن و عشق کے حدود سے گزر کر فلسفہ و اخلاق اور قومیت اور سیاسیات پر بھی حاوی ہے۔ مقلدین کے اس گروہ میں ادیب نیشاپوری، سالار شیرازی، شوریدہ شیرازی، شباب کرمانشاہی، رعدی آذرخشی، غمام ہمدانی، فرعی اصفہانی، بدیع الزماں خراسانی اور نادری مشہدی کا ذکر ضروری ہے۔

(۲) وہ شعرا، جو قدیم اصولِ عروض و قافیہ کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کرتے۔ مغربی اثر سے نئے قافیے اور نئی بحریں بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ اُن کا موضوعِ سخن قومیت، سیاست، اور سوسائٹی کی اصلاح ہے۔ دورِ حاضر میں یہ گروہ زیادہ مقبول ہے۔ شہزادہ ایرج مرزا، ملک الشعرا بہار، عارف قزوینی، پورداود، حبیب یغمائی، فرخی یزدی، کمال اصفہانی دہخدا، اشرف رشتی، حسام زادہ پازارگاد، فرہنگ طہرانی، رضازادہ شفق، سعید نفیسی، نظام وفا، محمود خاں افشار، اور سعادت نوری اس کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔

اِس عہد سے قبل فارسی سخن گوئی کے عنوانات میں عشق، مدح و ہجا تصوّف، فلسفہ و اخلاق، اور رزم و مرثیہ، شامل تھے۔ دورِ حاضر میں مدح کم ہو گئی اور جو رہ گئی اس میں غلو بالکل نہ رہا۔ تصوّف اور مرثیہ باقی رہا۔ عزت نفس، آزادی، ایثار اور غیرت و حمیت کے نئے عنوانات کا اضافہ ہو گیا۔ طنزیہ نظموں کا ایک عمدہ ذخیرہ پیدا ہوا۔

عام طور پر طرزِ ادا آسان، تخییل سادہ، محاکات واقعی، اور جذبات فطری ہیں۔ نہ باریک بینی ہے نہ خیال آفرینی نہ موشگافی ہے نہ بلند پروازی

دل کی نمایش ہے۔ دماغ کی نہیں۔ فطرت، صنعت پر، آمد آورد پر، اور بے تکلفی، تکلف پر غالب نظر آتی ہے۔" (ادبیات ایران نو)

موجودہ دور کی فارسی صنائع لفظی اور معنوی سے معرا نظر آتی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس عہد کے نثر نگار اپنی کم مائگی کے سبب عالمانہ اور مرصع زبان لکھنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ علم وفضل اور طرزِ قدیم کی قدر شناسی کے باوجود وہ ہر ایسی عبارت سے گریز کرتے ہیں جو صناعی کے زیور سے آراستہ ہو۔ تاکہ ہر قسم کے علمی، ادبی اور فنی مضامین بے دقت بیان کئے جاسکیں۔ مصلحین کا یہ گروہ جس نے دورِ صفویہ ومغلیہ کی مغلق اور مشکل عبارت کو صاف کر کے سادہ دپر کار نثر کو رواج دیا۔ مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ہے:۔

قایم مقام، سید جمال اسد آبادی، مرزا محمد علی پرورش، میرزا آقاخاں کرمانی، شیخ احمد روحی، امین الدولہ، مجد الملک، خبیر الملک، امیر نظام گروسی، محمد حسین فروغی، ملکم خاں، طالباف، مجد الاسلام کرمانی، شیخ یحییٰ کاشانی اور شیخ الرئیس

ان حضرات کے سامنے ایک بڑی دقت یہ تھی کہ اب تک فارسی نثر کے مضامین محدود اور معین تھے۔ مثلاً تصوف، حکمت، تاریخ و قصص اور ان مضامین کے لئے بھی صرف بقدر ضرورت اصطلاحات علمی موجود تھیں

لیکن اب مضامین کا دائرہ وسیع ہو جانے کی وجہ سے فارسی کا دامن تنگ نظر آنے لگا۔ چنانچہ یا تو بجنسہٖ دوسری زبانوں کے الفاظ زبان میں داخل کئے گئے یا ترکی، مصری اور بیرونی تراجم کو اخذ کیا گیا۔ چونکہ اس مہم میں ملکی جرائد بھی شامل تھے۔ اور انھوں نے تلاشِ الفاظ میں کدوکاوش سے کام نہیں لیا۔ اس لئے غیر ملکی الفاظ کثرت کے ساتھ زبان میں داخل ہوگئے۔ ایرانی حکومت ملک کی اس ضرورت سے بے خبر نہ تھی۔ وزارت معارف نے ایک انجمن فرہنگستان کے نام سے قایم کی۔ جس کے

۴۴ اراکین ہیں۔ اور جو وضع اصطلاحات کا کام بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔

دورِ جدید کے ادبی ذخیرہ کا ایک بڑا حصہ وہ تراجم ہیں جو دوسری زبانوں سے فارسی میں کئے گئے۔ اس سلسلہ میں انفرادی کوششوں کے علاوہ حکومتِ ایران کے دار الفنون کو بڑا دخل ہے۔ اس ادارہ نے ملک کے اُن فضلاء کی خدمات حاصل کیں۔ جو فرانسیسی، انگریزی، اور جرمنی وغیرہ زبانوں پر دستگاہ کامل رکھتے تھے اور اُن کے ذریعہ سے علوم جدیدہ کی لاتعداد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ یہ مفید سلسلہ اب بھی محکمہ معارف کی نگرانی میں جاری ہے۔ اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ فارسی ادب اس ادارہ کی کوششوں سے علمی دنیا کی تحقیقات سے بہت جلد آشنا ہوتا جاتا ہے۔ اور اس طرح طالبانِ علم و فن سرمایۂ مطالعہ کی کمی کو محسوس نہیں کرتے۔

مغربی تعلقات نے فارسی ادب اور ایرانی مصنفین پر جو اثرات کئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوشگوار اثر تحقیق علمی کا جذبہ ہے جو اس سے قبل ایران میں تقریباً مفقود تھا۔ ازمنۂ قدیم و وسطیٰ کی بیشتر تاریخی اور علمی کتابوں کے اکثر بیانات زبانی روایات پر مبنی ہیں۔ جن کی صداقت کا اکثر حالات میں مصنفین کے پاس قیاسی ثبوت بھی نہیں ملتا۔ مگر اس دور میں تاریخ، ادب، حکمت اور تربیت کے متعلق جو تحقیقات ہوئی ہیں۔ وہ فنی اعتبار سے نہایت بلند ہیں۔ تاریخ ایران کے محققین میں سب سے پہلے آقائے محمد بن عبد الوہاب قزوینی کا نام لیا جائے گا۔ اس لئے کہ آپ نے ایام جوانی سے اس وقت تک طویل مدت تحقیق و تدقیق اور اسنادِ معتبر کی تعلیم میں صرف کی ہے۔ ان کے علاوہ صفِ مورخین میں "تاریخ ایران بعد از اسلام" کے محققین میں آقا عباس اقبال، آقا نصر اللہ فلسفی، آقا احمد کسروی، آقا فرہودی، اور

آقا محیط طباطبائی، اور "تاریخ ایران در عصر حاضر" کے مولفین میں آقا عبداللہ امیر طہماسبی، آقا نوبخت، اور آقا حلاج اور ممالک بیرونی کی تاریخ کے مترجمین اور مرتبین میں آقا عبداللہ مستوفی، آقا عبدالحسین شیبانی، آقا فخر داعی، آقا عباس خلیلی، آقا رشید یاسمی، آقا سعادت نوری۔ اور دکتر رضا زادہ شفق کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ذیل میں ہم چند اہم تصنیفات اور تراجم کے نام درج کرتے ہیں۔
تاریخ مغول از عباس اقبال، ایران باستان از حسن پیرنیا، تاریخ نہضت ایران از حسن حلاج، ہشت سال در ایران از سعادت نوری، تاریخ تمدن اسلام از فخر داعی، تاریخ مختصر ایران از دکتر رضا زادہ شفق، تاریخ قرن نوزدہم از حسن فرہودی، تاریخ اروپا از نصراللہ فلسفی، شہریاران گمنام از احمد کسروی، فردوسی تاگور از محمد محیط، انقلاب فرانس از عبداللہ مستوفی، تاریخ شاہنشاہی پہلوی از حبیب اللہ نوبخت، تاریخ ملل شرق و یونان از عبدالحسین ہژیر۔

محکمہ معارف کی سرپرستی میں جو اہم ادبی خدمت ہوئی ہے۔ اس میں تحقیق اصول تعلیم و تربیت اور مباحث اخلاق کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ تعلیم و تربیت کے اصول عہد قدیم کی کتب میں جو کچھ بھی بیان کئے گئے ہیں، ان کو بچے کی نفسیات اور اس کے دماغی ارتقا سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس فن کو ایرانیوں نے اہل مغرب سے حاصل کیا اور اس پر کتابیں ترجمہ کیں۔ اور پھر خود بھی مرتب کیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب آقا حسین دانش نے مرتب کی۔ ان کے علاوہ آقا کاظم زادہ، دکتر عیسی صدیق، آقا حبیب اللہ آموزگار، آقا مبشر، آقا رسول تخشبی، آقا بہروز خاوری، اور آقا صادق نشاط کی تالیفات بھی اہم خیال کی جاتی ہیں۔

مباحث اخلاق پر علاوہ کتب درسیہ کے جو آقا عبدالعظیم۔ آقا امیر خیزی، آقا حسین سمیعی، اور حسام زادہ پازارگاد وغیرہ کی مرتبہ ہیں۔ مستقل تصنیفات بھی ہیں جو آقا حسن اسفندیاری، آقا علی دشتی اور آقا روحی کی فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔

غیر ملکی زبانوں کی لغات اس عہد میں علمی ضروریات کی بنا پر مرتب کی گئیں۔ ہم یہاں چند مستند لغات کا ذکر کرتے ہیں۔

فرہنگ انگلیسی فارسی (سلیمان حئیم) فرہنگ روسی بفارسی (شرف الدین قہرمانی) فرہنگ فرانسہ بفارسی (سعید نفیسی) لغت المانی بفارسی (رضا تربیت)

ذیل میں اصول تعلیم و تربیت، اور حکمت و اخلاق کی چند اہم کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔

روش پرورش (محمد علی بہروز خاوری) مبادی علم تربیت (محمد دشتی) تربیت اطفال (محمد رسول نخشبی)، رہنمائے شوہر جوان (ہدایت اللہ سہراب) تاریخ تعلیم و تربیت (دکتر عیسیٰ صدیق)، رہنمائے تربیت جوانان (محمد صادق نشاط) کنجکاوی در تعلیم و تربیت (ہوشیار) ارتقائے روح (رضائے شیرازی) حکمت سقراط (محمد علی فروغی) قانون فکر (حبیب اللہ نوبخت) اخلاق عملی (حسن اسفندیاری)، اخلاق ایران باستان (دین شاہ ایرانی) قانون اخلاق (غلام رضا رشید یاسمی)، اخلاق روحی (عطاء اللہ روحی) بجا گوا د گیتا (عباس شوستری)

ادبیات ایران نو کا حال اس عہد کے ڈراموں اور ناولوں کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

ایران میں ڈرامہ کی ابتدا ان تمثیلوں سے ہوتی ہے جو ایام عاشورہ محرم میں واقعات کربلا کے متعلق عوام میں جذبات محبت اہل بیت بیدار کرنے کے لئے لکھے اور کھیلے جاتے تھے ان کا آغاز شاہ عباس صفوی کے عہد سے

ہوتا ہے۔ ان ڈراموں کا علاوہ مذہبی حیثیت کے اور کوئی مرتبہ نہیں ہے
ایران جدید میں سب سے پہلے ۱۸۶۰ء میں مولیر کے تین ڈرامے ترجمہ
کئے گئے۔ جن میں سے ایک کا نام گزارش مردم گریز ہے۔ اس ڈرامہ میں
اشخاص تمثیل کے نام بدل کر ایرانی کر دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد مرزا
جعفر قراجہ داغی نے ۱۸۷۴ء میں ترکی زبان سے سات ڈرامے ترجمہ
کئے (۱) وزیر لنکران، (۲) خرس قلدار (۳) وکلاء مرافعہ (۴) خلیل کیمیا گر
(۵) حکیم نباتات (۶) مرد خسیس (۷) یوسف شاہ سراج۔ اس کے بعد
۱۹۰۸ء میں شاہزادہ ملکم خاں نے تین ڈرامے اتحاد (تبریز) میں شائع
کرائے اور اس کے بعد شرکت کاویانی برلن سے طبع ہو کر شائع ہوئے
(۱) سفر نامہ اشرف خاں (۲) آئین حکومت (۳) کربلا رفتن شاہ قلی میرزا
اس کے بعد تیاتر (طہران) میں اسی قسم کے ڈرامے شائع ہوتے رہے
اور اب برابر اس صنف میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جو ڈرامے طبع زاد
شائع ہو رہے ہیں وہ بہر نوع مکمل ہیں۔ اس لئے کہ اس صنف کی
ابتدا ترجمہ سے ہوئی۔ اور اصل ان زبانوں سے حاصل کی گئی
تھی جو اس صنف ادب کو معیار کی اعلیٰ ترین بلندی تک پہنچا چکی تھیں۔
اس صنف کے مقتدر نویسندگان میں میر سیف الدین کرمانشاہی
آقا ذبیح بہروز، آقا عشقی، اور آقا فکری کے نام خاص طور پر قابل
تذکرہ ہیں۔ ذیل میں چند مطبوعہ ڈراموں کے نام مع اسمائے مصنفین درج
کئے جاتے ہیں۔

دعدۂ زرتشت (سید علی آذری) عدالت بشر (عمادالدین آشفتہ)
ملکۂ عقل (عبدالحسین آیتی) مادر وطن (شاہرخ) یوسف و زلیخا
(سلیمان حکیم) داستان خونیں (عبدالرحمن خلخالی) آخریں یادگار نادر شاہ
(سید نفیسی) رستاخیز (میرزادہ عشقی) تاثیر زن وظیفہ شناس،
(عبدالحسین نوشیں) پروین دختر ساسانی (ہدایت صادق)

ہر زبان میں یوں تو ابتدائی نگارش افسانہ سازی اور قصہ پردازی سے ہی ہوتی ہے۔ اور فارسی ادب میں لاتعداد افسانے موجود ہیں۔ لیکن یہ افسانے یا تو کلیلہ دمنہ کی طرح حیوانات کی زبان سے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ یا خمسہ نظامی کی طرح منظوم افسانے ہیں یا اسکندر نامہ اور رموز حمزہ جیسی جو خلاف عقل، ناقابلِ قبول اور بے سروپا داستانیں ہیں۔ ان تینوں قسم کے افسانوں میں ایک ایسا نقص موجود ہے کہ وہ پوری صنف کو بے جان کر دیتا ہے۔ واقعیت اور روزمرہ کی زندگی کا نقشہ جس میں صحیح رنگ کاری کی گئی ہو اور سوسائٹی کے اصلی خدوخال نمایاں ہوں۔ افسانہ کا مقصد اور منصب ہے اگر یہ موجود نہیں تو افسانہ نگاری تو اسے دماغی کا غلط استعمال اور تضیع اوقات ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی تاریخی پس منظر پر افسانہ کی تعمیر کی جائے۔ قدیم فارسی ادب میں ان دونوں خصوصیات کا کہیں پتہ بھی نہیں۔

ایران نے صحیح افسانہ نگاری یورپ سے حاصل کی۔ مغربی زبانوں کے ناول فارسی میں ترجمہ کئے گئے اور بعد میں انھیں نقوش پہ ایرانی مصنفین نے افسانے تصنیف کئے۔ مترجمین میں آقا طاہر میرزا، آقا یوسف اعتصامی، آقا حسن ناصر، ڈکٹر قاسم غنی، آقا محمد سعیدی، آقا امیر قلی امینی اور آقا نصراللہ فلسفی کے نام خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔

مصنفین کی تعداد اگرچہ کم ہے۔ اور تصانیف افسانہ نگاری کے اعلیٰ معیار پر صحیح نہیں اترتیں لیکن آقا شمس طغرائے خسروی، آقا موسیٰ نثری آقا میر محمد حجازی، آقا محمد مسعود، آقا علی اصغر شریف، آقا مشفق کاظمی، آقا رحیم زادہ صفوی، آقا جمال زادہ، اور آقا فخرالدین شادمان نے اس سلسلہ میں مفید خدمات انجام دی ہیں۔ ذیل میں چند معیاری تراجم اور طبع زاد ناولوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ عزیز و غزال

(اشرف الدین) گریہ کردہ ام (جہانگیر جلیلی) شمس و طغرا (محمد باقر خسروی) ہما (میر محمد حجازی) در راہ ہند (فخر الدین شادمان) مکتب عشق (علی اصغر شریف) شہر بانو (رحیم زادہ صفوی) طہران مخوف (مشفق کاظمی) عشق و سلطنت (موسیٰ نثری) ستارگان سیاہ (سعید نفیسی)

حصہ دوم

تذکرہ و تبصرہ

(۱)

ماقبل دور غزنویہ

رودکی

۹۴۱ — ۸۸۴ء

ابو عبد اللہ جعفر بن حاکم نام تھا اور رودک کا رہنے والا تھا۔ چونکہ اس نے سب سے پہلے فارسی زبان میں اپنا دیوان مرتب کیا اس لئے اُس کو آدم الشعرا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ بچپن سے اندھا تھا۔ حافظ قرآن و قاری تھا۔ اور تمام علوم پر عبور رکھتا موسیقی سے خاص شوق تھا۔ اور اس فن سے اچھی طرح واقف تھا۔ خوش گلو اور حاضر جواب تھا نصر بن احمد سامانی کے دربار میں اسے بڑا اعزاز حاصل تھا۔ صاحب شعر العجم کا بیان ہے کہ "اس کو اس قدر جاہ و دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امرا کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ جب اس کی سواری نکلتی تو دو سو زرین کمر غلام ساتھ ساتھ چلتے اور سفر میں اس کا اسباب چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔" نصر سامانی کے حکم سے کلیلہ دمنہ کو فارسی میں نظم کیا۔ اور چالیس ہزار درہم انعام پائے۔

رودکی کے اشعار کے مؤثر ہونے کا ایک مشہور واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ امیر نصر، بادغیس آیا۔ یہاں کی آب و ہوا اس قدر

پسند آئی کہ چار برس ہو گئے۔ اہل دربار اور فوجی وطن کی یاد میں بیقرار تھے۔ رودکی سے تمام امرار نے وعدہ کیا کہ اگر وہ شاہ کو مراجعت وطن پر آمادہ کر دے تو پانچ ہزار اشرفیاں انعام پائے گا۔ اس نے منظور کر لیا۔ اور قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی　　　یاد یار مہرباں آید ہمی

والہانہ انداز میں گایا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ بغیر موزے پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔ اور ایک منزل پر جا کر دم لیا۔

رودکی نہایت پُر گو تھا۔ اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔ تمام اصناف سخن (قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ) پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا کلام واقعہ نگاری، حسن تاثیر، پند و نصیحت عشق و محبت سے لبریز ہے۔ مدح بغیر تخیل کے پست درجہ کی خوشامد ہے رودکی کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

شاہے کہ بروز رزم از رادی　　　زریں نہد بہ تیر در پیکاں
تا کشتۂ اوزاں کفن سازد　　　تا خستۂ اوزاں کند درماں

اس کے قصائد میں سلاست، متانت اور معنویت کا خاص اہتمام ہے تشبیب خصوصیت کے ساتھ عمدہ ہوتی ہے۔ قصیدہ کی یہ ترتیب کہ اول تمہید پھر مدح کی طرف گریز، اور اس کے بعد تعریف اور آخر میں دعا فارسی میں رودکی کی ایجاد ہے۔

اس کی غزلیات میں سادگی اور فطری جذبات عشق پائے جاتے ہیں۔

دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس　　　آساں بربائی دل و آساں ببری جاں
مشوش است دلم از کرشمہ سلمیٰ　　　چناں کہ خاطر مجنوں ز طرۂ لیلیٰ
زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را　　　شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را

رودکی کے مرثیے صرف بے معنی نوحہ گری نہیں بلکہ ان میں حکیمانہ

انداز سے صبر و تلقین کا پہلو بھی ہے۔

اے آنکہ غمگینی و سزا واری | واندر نہاں سرشک ہمی باری
رفت آنکہ رفت، آمد آنکہ آمد | بود آنچہ بود خیرہ چہ غم داری
ستی مکن نشنود او ستی | زاری مکن، کہ نشنود او زاری
شو تا قیامت زاری کن | کے رفتہ را بہ زاری باز آری

ذیل میں ہم رودکی کے متعلق مختلف ناقدین اور شعراء کی رائے درج کرتے ہیں۔

عنصری۔ غزل رودکی وار نیکو بود | غزل ہائے من رودکی وار نیست

معروف لخی:۔ کلمات۔ از رودکی شنیدم سلطان شاعران

دقیقی:۔ کرا رودکی گفتہ باشد مدیح | امام فنون و سخنور بود

صاحب چہار مقالہ نے اس کے مشہور قصیدہ کے متعلق جس میں اس نے امیر نصر کو بادغیس سے وطن کی طرف مراجعت کی طرف توجہ کیا ہے لکھا ہے "ہنوز این قصیدہ را کسے جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ ازیں مضائق بیروں رفتہ"

دقیقی (۹۶۷ء) ابو منصور محمد بن احمد، سمرقند کا رہنے والا تھا۔ نوح بن منصور سامانی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اسی کے حکم سے شہنشاہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ اشعار کی تعداد کے متعلق ایک ہزار اور بیس ہزار کی دو روائتیں ہیں۔ فردوسی نے اشعار اپنے شاہنامہ میں شامل کر کے دقیقی کو زندہ جاوید بنا دیا۔ فردوسی کہتا ہے:

جوانے بیامد کشادہ زباں | سخن گو خوش طبع و روشن رواں
بہ شعر آرم ایں نامہ را گفت من | ازو شادماں شد دل انجمن
زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار | بگفت و سر آمد ورا روزگار
گراں مایہ نزد شہنشہ رسد | روانِ من از خاک برمہ رسد
بداند کہ پیش از تو آخر کسے | دریں داستاں رنج بردش بسے

دقیقی کے کلام میں اعتماد اور پختگی پائی جاتی ہے۔ اس کے زمانہ

میں عربی الفاظ بڑی کثرت سے پائے جاتے تھے۔ دقیقی نے زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے خالص فارسی کی پرورش کی۔ قصیدہ اور غزل کو بھی اس نے ترقی دی۔ نیچرل شاعری کی ابتدا کی۔ ذیل کے اشعار اس کی طرز کے آئینہ دار ہیں۔

غزل:- گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد　　آرے دہد و لیک بہ عمر دگر دہد
من عمر خویشتن بہ صبوری گزاشتم　　عمر دگر بباید تا صبر بر دہد

نیچرل شاعری: سحرگاں کہ باد نرم جنبید　　بجنباند درخت سرخ واعفر
تو پنداری کہ از گردوں ستارہ　　ہمے بارید بر دیبائے اخضر
نگاراند نگار و لون در لون　　ہزاراں ورشتہ پیکر بہ پیکر

دقیقی کو ایک خوش رو غلام سے محبت تھی۔ اسی کے ہاتھوں ۹۷۵ء میں قتل ہوا۔

(۲)

دورِ غزنویہ

عنصری ابو القاسم حسن بن احمد نام اور بلخ کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ، جن کا اس کی اوائل عمر ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ تاجر تھے۔ عنصری نے بھی آبائی پیشہ اختیار کیا۔ لیکن فطرت نے اس کو علم و ادب کے لئے پیدا کیا تھا۔ ہر طرف درسگاہیں کھلی ہوئی تھیں تمام علوم و فنون آزادی سے حاصل کئے اور شاعری کو اپنا فن قرار دیا اور نصر بن سبکتگین کے ذریعہ سے سلطان محمود کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اور بڑی جلد ترقی کر کے ملک الشعرائی کا مرتبہ حاصل کیا۔ سلطان کی ہنر پروری نے دربار میں تقریباً چار سو شعراء کو جمع کر لیا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بادشاہ کے سامنے اپنا کلام بغیر عنصری کو دکھائے نہیں پیش کر سکتا

تھا۔ جس کا یہ اثر تھا کہ بڑے بڑے شاعر عنصری کی مداح سرائی کو فخر سمجھتے تھے۔ دولت کی اس درجہ فراوانی تھی کہ چار سو زرین کمر غلام ساتھ رہتے تھے۔ اور سفر کے وقت اس کا سامان جو بیشتر طلائی و نقرئی ہوتا تھا۔ چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔ اور حد یہ کہ دیگیں بھی طلائی و نقرئی ہوتی تھیں (مجمع الفصحاء)

عنصری نے قصائد کے علاوہ مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں وامق و عذرا مشہور ہے۔ بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ بہت پر گو تھا۔ اور برجستہ کہتا تھا۔

ایک مرتبہ بادشاہ چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور زخمی ہوا۔ عنصری نے برجستہ کہا۔

شاہا! ادبے کن فلک بدخو را — کآسیب رسانید رخ نیکو را
گر گوئے خطا رفت بہ چوگانش زن — ور اسپ غلط کرد ببخش او را

عنصری کے قصائد فنی اعتبار سے نہایت مکمل ہیں۔ اس نے قصیدہ میں پہلی بار واقعہ نگاری کا پہلو پیدا کیا اور محمود کے جنگی کارناموں کو قصیدہ میں بیان کیا۔ ملتان کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

بہ مولتاں شد و در رہ دو بیست قلعہ کشاد — کہ ہر یکے را صد بند بود چوں خیبر

اسی طرح مناظر قدرت کی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ بہار کا ایک منظر اس طرح بیان کیا ہے۔

باغ ہمچوں کلبہ بزاز پر دیبا شود — باد ہمچوں طبلہ عطار پر عنبر شود
روئے بندے ہر زمینے حلہ چینی شود — گوشوار ہر درختے رشتہ گوہر شود

عنصری نے قصائد میں صنائع و بدائع کا استعمال نہایت خوبی سے کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنعتیں برجستہ کلام سے پیدا ہوئی ہیں۔ کاوش سے پیدا نہیں کی گئیں۔ ایک پورا قصیدہ صنعت سوال و جواب میں کہا ہے۔

گفتم اندر عذابِ عشقِ تو ام گفت عاشق نکو بود بہ عذاب
گفتم از چیست روئے راحت من گفت ہر دم زردی خسرو شاب

تقسیم:-

یا بہ بند دیا کشاید، یا ستاند یا دہد تا جہاں باشد ہمی مر شاہ را ایں یادگار

تنسیق الصفات:-

سمن بوئے، شبہ موئے، بلا جوئے، جفا گوئے پریزادے، پریروئے، پری چہرے، پری پیکر

فردوسی
۱۰۲۵

ابو القاسم حسن بن علی نام طوس کا رہنے والا تھا۔ فردوسی کی سوانح حیات کے متعلق دو قسم کے ذرایع ہیں۔ ایک وہ واقعات اور اطلاعات جو مختلف تذکروں میں درج ہیں۔ مثلاً (۱) تاریخ گزیدہ (۲) لباب الالباب (۳) چہار مقالہ (۴) تذکرہ دولت شاہ، دوسرے خود فردوسی نے شاہنامہ میں جا بجا اپنی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں۔ ہم نے دونوں خزانوں سے آبدار موتی چن لئے ہیں۔

فردوسی ایک اچھی حیثیت کا زمیندار تھا۔ فردوسی کے صرف ایک لڑکی تھی اور شاہنامہ کی یہ کاوش اس کے جہیز کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے تھی۔

شاہنامہ کی تیاری میں فردوسی نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے عربی اور فارسی کے بہت سے تذکرے جو اُس کے مطالعہ میں رہے تھے معلومات کا ذریعہ بنے۔ ان میں خاص یہ ہیں۔ (۱) تاریخ ایران کا عربی ترجمہ جو ۷۲۳ء میں ہشام بن عبد الملک کے عہد میں کیا گیا۔ (۲) خدائی نامہ جس کو عبد اللہ بن مقفع نے عہد عباسیہ میں عربی میں ترجمہ کیا۔ (۳) آئین نامہ مترجمہ عبد اللہ بن مقفع (۴) تاریخ دولت ساسان (۵) کارنامہ نوشیروان۔ ابو منصور کا شہنشاہ نامہ، شاہنامہ کی تصنیف کے لئے اصلی محرک

ثابت ہوا۔ شاہنامہ کی تصنیف کا کام تقریباً ۹۷۵ء میں شروع ہوا۔ اور
۲۵ سال کی سخت محنت کے بعد ۹۹۹ء میں پہلا حصہ مکمل ہوا۔ جو
احمد بن محمد بن ابو بکر کے نام معنون کیا گیا۔ اسی زمانہ میں فردوسی
خواجہ بزرگ احمد وزیر کے ذریعہ سے سلطان محمود کے دربار میں
باریاب ہوا۔ سلطان اپنے آباواجداد کے منظوم کارنامے سن کر بیحد
محظوظ ہوا۔ اور فردوسی کو حکم دیا کہ جلد سے جلد کتاب مکمل کرے۔
یہ بات آج تاریخی حقیقت کے طور پر بیان کی جاسکتی ہے۔ کہ سلطان
نے فردوسی کو ہر شعر کے بدلے میں ایک دینار دینے کا وعدہ کیا تھا۔
۳۵ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد ۱۰۱۰ء میں ۶۰ ہزار اشعار مکمل
کرکے پیش کئے۔ سلطان نے حاسدین فردوسی کے ورغلانے پر آپ کی
محنت کا صلہ طلائی سکوں کی بجائے نقرئی سکوں میں ادا کیا۔ فردوسی
کو اس وعدہ خلافی سے جس قدر تکلیف ہوئی۔ اس کا اندازہ اس سے
کیا جاسکتا ہے کہ وہ حمام میں تھا۔ جس وقت یہ رقم پہنچی، اس نے
نقرئی سکوں کا نام سنتے ہی سب کو کھڑے کھڑے لٹا دیا۔ اور سلطان کے
خوف سے راتوں رات سفر کرکے ہرات پہنچا اور شاہنامہ میں سلطان کی
ہجو کے اشعار شامل کئے۔ ان اشعار کی اصلی تعداد سو بتائی جاتی ہے۔
لیکن گورنر طبرستان کے کہنے سے فردوسی نے اُن کو ضائع کر دیا
صرف چھ باقی رہ گئے۔ جو چہار مقالہ میں نظامی عروضی نے لکھے ہیں۔
اُس کے بعد ایک عرصہ تک فردوسی یہیں رہا۔ اور ایک مثنوی
یوسف زلیخا تصنیف کی۔ ۹۰ سال کی عمر میں اپنے وطن طوس واپس
آیا اور ۱۰۲۵ء میں انتقال کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے اپنی اس غلطی کا ایک عرصہ
کے بعد احساس کیا۔ اور ۶۰ ہزار طلائی سکے اس کے پاس بھیجے۔ لیکن کہتے ہیں
کہ ایک دروازے سے سونے سے لدے ہوئے اونٹ داخل ہوئے

اور دوسری طرف سے فردوسی کا جنازہ نکلا۔ مجبوراً اس روپیہ سے مرو اور نیشاپور کے راستہ پر سرائے بنا دی گئی۔

فردوسی کو بقائے دوام کے دربار میں ممتاز جگہ شاہنامہ کی بدولت حاصل ہوئی۔ اگرچہ اس کی تصنیفات میں ایک مثنوی یوسف زلیخا اور چند قطعات بھی ہیں۔

شاہنامہ کی چند خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) مشرق و مغرب کے محققین مثلاً ثعلبی نے پوری چھان بین کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں جتنے واقعات بیان کئے ہیں اُن کا ماخذ اکثر و بیشتر معتبر کتب تاریخ ہیں۔ اور نظم کرنے میں یہ احتیاط کی گئی ہے کہ واقعات کا چہرہ مسخ نہ ہونے پائے۔

(۲) فردوسی کے عہد کی تمام تصنیفات میں بکثرت عربی کے الفاظ فقرے اور محاورے پائے جاتے ہیں۔ لیکن شاہنامہ میں اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عربی الفاظ سے گریز کیا جائے۔

(۳) ۶۰ ہزار اشعار کی بسوط کتاب میں شرافتِ نسبتی اور شجاعتِ ملی کے واقعات بیان کرنے میں فردوسی نے وہ کامیابی حاصل کی جو دقیقی ایک ہزار اشعار میں نہ کر سکا۔

(۴) شاہنامہ ناموران ایران کے جنگی کارناموں کی پُرجوش داستان ہی نہیں ہے۔ بلکہ تاریخِ ایران کا طالب علم اس سے ہر دور کے تہذیب و تمدن، اور رسم و رواج کے متعلق نہایت اہم معلومات حاصل کر سکتا ہے شادی کے مراسم، موت و حیات کی رسمیں، مالگزاری کی تفصیل، ٹیکسوں کی تعداد ایسے صدہا واقعات شاہنامہ میں ملتے ہیں۔

(۵) عریانی و ابتذال ایشیائی شاعری کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے لیکن شاہنامہ کا دامن اس سے بے داغ ہے۔

(۶) فردوسی کے خلاف الزام ہے کہ وہ میدانِ رزم کا سپاہی ہے

آداب محفل آرائی سے واقف نہیں۔ محبوب کے لئے اس نے جابجا کرخت اور گراں الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مولانا شبلی نے کیا خوب جواب دیا ہے۔ "وہ کابل اور زابلستان کے محبوب کا ذکر رہا ہے۔ لکھنؤ کا نہیں .... کابل کا معشوق لکھنؤ کی طرح دھان پان نہیں ہوتا بلکہ بالیدہ قامت، پر اندام اور تنومند ہوتا ہے۔" جہاں تک محفل آرائی کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے متعدد مقامات پر ایسی محفل سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دیکھئے زال اور رودابہ کی ملاقات، افراسیاب کی بیٹی منیژہ کی سیر کا منظر، بیژن کی زبانی وغیرہ

(۷) جہاں تک واقعہ نگاری، منظر کشی اور جذبات انسانی کے اظہار کا تعلق ہے۔ فردوسی کسی سے پیچھے نہیں۔ واقعہ کے تمام جزئیات نہایت کدوکاوش سے اس طرح جمع کرکے بیان کرتا ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ اس کی واقعہ نگاری استعاروں کی زیر بار منت نہیں۔ تشبیہیں جو استعمال کی ہیں وہ بھی قریب الفہم ہیں۔ دیکھئے اس واقعہ کو کہ خاقانِ چین کو رستم نے ہاتھی سے کمند ڈال کر گرا لیا، کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

چو از دست رستم رہا شد کمند ۔ سر شہریار اندر آمد بہ بند
ز پیل اندر آورد و زد بر زمین ۔ بہ بستند بازوئے خاقانِ چین

(۸) رزمیہ شاعری میں شاہنامہ حرف آخر ہے۔ آلاتِ حرب کی تفصیل، صف آرائی کے طریقے، جنگ کے قاعدے، حملہ کا زور، جنگ کا نقشہ ہر چیز مکمل ہے۔

شاہنامہ کے متعلق اہل کمال کی رائیں:۔

۱۔ مولانا شبلی:۔ شاہنامہ ایران کا انسائکلو پیڈیا ہے

۲۔ امامی ہروی نے اس کو ابیات کا پیغمبر گردانا ہے۔

۳- علامہ ابن اثیر:- شاہنامہ قرآن العجم ہے۔
۴- نظامی:- سخن گوئے پیشینہ دانائے طوس ۔ کہ آراست زلف سخن چوں عروس
۵- سعدی:- چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد ۔ کہ رحمت برآں تربت پاک باد
۶- انوری:- آں خداوند بود و ما بندہ
۷- سرگور اوسلے:- فردوسی ایران کا ہومر تھا۔

منوچہری (۱۰۴۲ء) ابوالنجم احمد نام اور منوچہری تخلص تھا۔ دامغان کا رہنے والا تھا۔ ذوقِ شعری فطرت سے لے کر آیا تھا۔ بچپن سے شعر کہتا تھا۔ اس لئے جوانی ہی میں اس کی شاعری کا شہرہ ہو گیا اور امیر منوچہر بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر والی طبرستان کے دامن دولت سے وابستہ ہوا۔ اُس کا تخلص منوچہری اسی تعلق کی یادگار ہے۔ ۱۰۲۹ء میں امیر منوچہر کا انتقال ہوا تو اُس نے عنصری کے ذریعہ سے سلطان محمود کے دربار میں رسائی حاصل کی جہاں اُس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ اس کے مطبوعہ دیوان میں تین ہزار شعر ہیں۔ منوچہری کو اپنی چند خصوصیات کے باعث معاصرین میں ایک ممتاز جگہ حاصل ہے۔

غالباً وہ سب سے کم سن شاعر تھا جو اپنے کلام کی خوبی کی بدولت بزرگی بعقل است نہ بسال کا مصداق بنا۔

دورِ غزنویہ میں عربی اثر کو مٹانے کی کوشش خاص طور پر کی گئی تھی۔ چنانچہ فردوسی اور اسدی نے عربی الفاظ و تراکیب سے قطعاً احتراز کرنا چاہا ہے۔ لیکن منوچہری عربی تقلید کا اس قدر دلدادہ تھا کہ متعدد قصائد عربی بحروں اور قافیوں میں لکھے ہیں۔ عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس لئے اپنے قصیدوں میں نہ صرف اپنی عربی دانی کا فخریہ ذکر کیا ہے۔ بلکہ مشہور عربی قصائد کے فقرے کے فقرے نقل کر دئے ہیں۔ عربی تلمیحات اور تشبیہیں اکثر استعمال کی ہیں۔ مگر اس کا اعتراف

کرنا پڑتا ہے کہ اس "آورد" نے اس کے کلام کو پست نہیں کیا بلکہ اس نے ان سب چیزوں کو اس سلیقہ سے استعمال کیا ہے کہ وہ رخ پر غازہ بن گئی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ کلام مشکل ہوگیا۔

اس کے کلام میں روانی، سلاست اور برجستگی خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ خوبصورت تراکیب اور صحیح منظرکشی نے کلام کو اور دلکش بنا دیا ہے۔ بہار کی تعریف اور اس کے مناظر کی تصویرکشی شعرائے ایران کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ لیکن اس میں منوچہری کو جو کمال حاصل تھا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔ ہزار بار اس نے بہار کا منظر دکھایا۔ لیکن ہر بار نیا رنگ اور نقشہ ہوتا تھا۔ پھر اس کی ہر تصویر نہایت مکمل ہوتی تھی۔ پھول پتوں کا حال، گل و بلبل کا افسانہ، طائرانِ بہار کے نغمے غرض کچھ چھوڑتا نہ تھا۔

اقسام نظم میں مسمط اس کی ایجاد ہے۔ اور ان مسمطات میں اس نے واقعہ نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

عمدہ اور موزوں تشبیہات اس کے کلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور اسی صنعت نے واقعہ نگاری، منظرکشی، حلیہ نگاری اور نئے اسلوب پیدا کرنے میں معاونت کی ہے۔ ذیل میں ہم چند خوبصورت تشبیہیں نقل کرتے ہیں۔

زلزلہ:- تو گفتی ہر زمانے زندہ پیلے | بلرزاند ز رنج پشہ گان تن

ہلال:- چنان چون دو سر از ہم باز کردہ | ز زر سرخ یک دست آورنجن

طلوع آفتاب:- بکردار چراغ نیم مردہ | کہ ہر ساعت فزون گردد ش روغن

بارش کے قطرے فرشِ زمین پر:- گوئی کہ مشاطہ زبر فرقِ عروساں | مادر دہمے ریزد باریک بمقدار

فرخی | ابوالحسن علی نام اور فرخی تخلص تھا۔ شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ علم و ادب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ موسیقی کی بھی تعلیم پائی تھی اور چنگ بجانے میں خاص مہارت حاصل کی تھی۔ شروع میں خلف بن احمد

حاکم سیستان کا ملازم رہا۔ اس کے بعد گورنر بلخ ابو المظفر کے دربار میں اس کے وزیر کے ذریعہ سے رسائی حاصل کی۔

فرخی کو قدرت نے جہاں، حسن باطن فیاضی سے عطا کیا تھا حسن ظاہری سے محروم رکھا تھا۔ ابو المظفر کے وزیر نے اس کی غیر شاعرانہ شکل دیکھ کر اس کا امتحان لینا چاہا۔ چنانچہ فرمائش کی کہ صبح کو جب دربار میں حاضری کے لئے آؤ تو داغ گاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھ کر لاؤ۔ وزیر نے داغ گاہ کا پورا نقشہ زبانی بیان کر دیا کہ ایک سبزہ زار میں امیر مع مصاحبین مصروف نشاط ہوتا ہے۔ شراب کا دور چلتا ہے۔ اور انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے۔ فرخی نے رات بھر میں قصیدہ تیار کیا۔ اور صبح کو جب پیش کیا ہے۔ تو وزیر پھڑک اٹھا۔ اور دربار میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا کہ فرخی سے بہتر شاعر آج تک نہیں پیدا ہوا۔ کئی برس ابو المظفر کے انعام و اکرام سے بہرہ ور ہونے کے بعد سلطان محمود کے دربار میں جگہ حاصل کی۔ اور اپنی لیاقت کی وجہ سے بہت جلد مقربین سلطان میں شمار ہونے لگا۔ فرخی کی ایاز سے اس قدر دوستی ہو گئی تھی کہ اسی باعث ایک بار اس پر سلطان کا سخت عتاب نازل ہوا۔

فرخی کے اشعار نہایت صاف، اور سلیس ہوتے ہیں۔ کلام میں ایک خاص جوش پایا جاتا ہے۔ صنایع بدایع کا استعمال نہایت احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔ کبھی اعتدال کی حد سے نہیں بڑھا۔ منظر کشی اور واقعہ نگاری میں بھی کافی دستگاہ تھی۔

ایک محفل عیش کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

سرو ساقی و ماہ رود نواز	پردہ بستہ در رہ شہناز
زخمۂ رود زن نہ بیت و نہ تیز	زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز
بوستانے ز لالہ و سوسن	ہمچو روئے تذرو و سینہ باز
ماہ روئے نشاندہ اندر پیش	خوش زبان و موافق و دمساز

بادہ چوں گلاب روشن و تلخ — ماندہ در خم زنگاہ آدم باز
از چنیں مجلس و چنیں بادہ — ہیچ زاہد مرا ندارد باز

فرخی غالباً پہلا فارسی شاعر تھا۔ جس نے ایسا مرثیہ لکھا جس میں تمام لوازم مرثیہ گوئی پائے جاتے ہیں۔ متانت و سنجیدگی کا دامن بھی

ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ سلطان محمود کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں سلطان کے اوصاف حمیدہ نہایت درد انگیز انداز میں بیان کرکے ملک پر اس کی وفات سے جو اثر ہوا اس کا ذکر کیا ہے اور آخر میں نہایت پر جوش انداز میں سلطان کو مخاطب کرکے بڑا پُردرد نوحہ کہا ہے۔

اُس نے رباعیات بھی کہی ہیں۔ جن میں اکثر عاشقانہ مضامین ہیں اس شاعر باکمال نے ۱۰۲۹ء میں انتقال کیا۔

---

(۳۴)

ابتدائی دور سلجوقیہ

ابو سعید ابو الخیر (۹۶۷ — ۱۰۴۹)

سلطان ابو سعید ابو الخیرؒ ۹۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۰۴۹ء میں انتقال کیا۔ صوفی تھے۔ اور ابتدا میں چودہ برس تک مجذوب رہے۔ ابو علی سینا کے ہم عصر تھے۔

حضرت ابو سعید ابو الخیرؒ پہلے شخص تھے جنھوں نے مسائل تصوف رباعیات میں بیان کئے۔ سنائی۔ عطار اور رومی اس کے بعد ان میں انھیں کے پیرو تھے۔ ان کی رباعیات میں مشکل مسائل تصوف باوجود شعری قیود

اور رباعی کی تنگ دامنی کے نہایت خوبی اور وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے خاص مضامین یہ ہیں۔ وحدت الوجود، ہمہ اوست۔ ق وحن آئینہ دار صفات خداوندی ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں۔ اس لئے کسی مذہب کو بُرا نہیں کہنا چاہئے۔

رباعیات کی زبان صاف، اور طرز ادا سلیس ہے۔ ان مسائل کے بیان میں استعارات اور تشبیہات کے بے جا استعمال سے الجھاؤ نہیں پیدا کیا ہے۔ ایک رباعی دیکھئے۔

راہِ تو بہر قدم کہ پویند خوش است   وصلِ تو بہر سبب کہ جویند خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست   نام تو بہر زباں کہ گویند خوش است

نظام الملک طوسی

۱۰۹۲ — ۱۰۱۷

ابو علی حسن بن اسحاق نام اور نظام الملک لقب تھا۔ طوس کے رہنے والے تھے۔ امام موفق کے حلقہ میں علوم عقلی و نقلی پر عبور حاصل کیا۔ پھر علی بن شاذان گورنر بلخ کے سکریٹری کی حیثیت سے عملی دنیا میں قدم رکھا۔ الپ ارسلان کی تخت نشینی کے بعد نظام الملک وزیر اعظم کے بلند مرتبہ عہدے پر سرفراز ہوئے۔ ۱۰۶۵ء میں بغداد میں علوم دینی کا ایک کالج مدرسہ نظامیہ کے نام سے قایم کیا۔ اور اور اس کے اخراجات کے لئے ایک جاگیر وقف کر دی۔ اس مدرسہ کا نصاب آج تک درس نظامیہ کے نام سے عربی مدرسوں رائج ہے۔

۱۰۷۲ء میں الپ ارسلان کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا ملک شاہ جس کی عمر صرف ۱۷ سال کی تھی۔ تخت نشین ہوا۔ اور نظام الملک اس کے مشیر مقرر ہوئے۔ نظام الملک کی عمر اس وقت ۶۰ برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن باوجود پیرانہ سالی اور فرائض منصبی کی کثرت واہمیت کے آخر دم تک خدمت علم و مذہب میں بھی مصروف

رہے۔ خود بغداد اور اصفہان کے کالجوں کا معائنہ کرنے جاتے تھے اور وہاں کے علمار سے مذہبی اور علمی عنوانات پر مباحثے کرتے تھے۔

آپ کی مشہور تصنیف سیاست نامہ اس عہد کی نہایت گراں قدر تصنیفات میں شمار کی جاتی ہے۔ پوری کتاب پچاس ابواب پر منقسم ہے جن میں نظم و نسق سلطنت کے متعلق سیر حاصل بحث کر کے اصول رہنمونی مرتب کئے گئے ہیں۔ کتاب میں بہت سی اہم تاریخی روایات بھی موجود ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہمیں اس زمانہ کے مذہبی اور سیاسی خیالات کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب ۱۰۹۲ء میں مکمل ہوئی۔ پروفیسر براؤن نے اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ بے حد سلیس اور غیر مرصع زبان میں لکھی گئی ہے۔ صنایع و بدایع کے استعمال سے بڑی احتیاط کے ساتھ گریز کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر اس قدر سلیس ہے کہ روزمرہ کا لطف آتا ہے یہ کتاب اس زمانہ کی بہترین نثر کا نمونہ ہے۔"

ناصر خسرو حکیم ابو معین الدین ناصر خسرو پورا نام تھا۔ ۱۰۰۳ء میں خراسان میں پیدا ہوئے۔ ۲۲ برس کی عمر تک تحصیل علوم میں مصروف رہے۔ اس کے بعد خراسان کے حاکم مالیات کے سکریٹری کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ ابتدائے ۱۰۴۵ء میں انھوں نے ایک خواب دیکھا جس میں انھیں تنبیہ کی گئی تھی کہ حکیم کا معزز لقب ایک شراب خوار کو زیب نہیں دیتا۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے شراب نوشی ترک کر دی۔ اسی سال حج کے لئے گئے اور سفر میں علاوہ تمام و فلسطین کے مصر کی بھی سیر کی مصر میں "اسمٰعیلی" فرقہ کے عقائد سے متاثر ہو کر اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ اور بہت جلد "حجت" کے خطاب

سے سرفراز کئے گئے۔ اور خراسان میں تبلیغ مذہب کے لئے مقرر ہوئے ۱۰۸۸ء میں ۱۴۰ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔

غزلیات کا ایک دیوان، سفرنامہ، کنز الحقائق اور رشنو یان روشنائی نامہ اور سعادت نامہ مصنفات نظم و نثر ہیں۔

سفرنامہ کی عبارت سادہ اور سلیس ہے۔ اشعار میں سادگی و سلاست کے ساتھ فلسفہ و موعظت بھی ہے۔ لیکن تخیل کی چاشنی نہ ہونے سے بے کیف ہے۔

زاد برگیر و سبک باش، مکن جائے قرار — خانہ را کہ مقیمانش ہمہ در سفر ند
حکمت آبیست کجا مردہ بد و زندہ شود — حکما بر لب ایں آب مبارک شجر ند

امام غزالی (۱۰۵۸ - ۱۱۱۱) ابو حامد محمد الغزالی نام تھا۔ ۱۰۵۸ء میں طوس میں پیدا ہوئے۔ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اپنے والد کے ایک دوست سے درسیات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ایک مدرسہ میں تمام علوم متداولہ پر عبور حاصل کیا۔ آپ نے خاص طور پر مذاہب عالم کا نہایت غور و فکر سے مطالعہ کیا۔ اور دوسرے مذاہب کے تمام فرقوں کے عقائد کا اسلامی تعلیمات سے موازنہ کر کے فلسفۂ اسلام کو نئی زندگی بخشی، امام غزالیؒ ایک عالم محدث، مفسر، فلسفی، اور واعظ ہی نہ تھے بلکہ صاحب دل اور صوفی بھی تھے۔ اسی لئے اُن کو امام اور حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے

وطن میں آپ کی تشنگیٔ علم رفع نہ ہوئی تو نیشاپور گئے۔ اور یہاں کے قیام میں کئی مفید رسالے تصنیف کئے۔ جن کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے۔ نظام الملک طوسی نے امام صاحب کی لیاقت کا شہرہ سن کر مدرسہ نظامیہ بغداد میں استاد مقرر کیا۔ جہاں آپ نے ۱۰۹۱ء سے ۱۰۹۵ء تک

چار سال درس دیا۔ یہیں سے حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور بیت المقدس کی بھی زیارت کی۔ قیام شام میں آپ نے اسلامی علم کلام کی بہترین کتاب احیاء العلوم عربی میں تصنیف فرمائی۔ اور بعد میں خود ہی فارسی میں کیمیائے سعادت کے نام سے ترجمہ کیا۔ سفر حجاز و شام سے واپسی پر کچھ عرصہ بغداد میں درس دیا اور اس کے بعد مدرسہ نظامیہ نیشاپور کے طالبانِ علم کو سیراب فرمایا۔ ۱۱۱۱ء میں آپ نے اپنے وطن طوس میں انتقال کیا۔ امام صاحب کی تصنیفات کی تعداد نو سو ۹۰۰ تک پہنچی ہے۔ یہ سب حقائق و معارف سے لبریز ہیں۔ کیمیائے سعادت اسلامی انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں عقائد و اصول اسلام کا کوئی نکتہ ایسا نہیں جو واضح طور پر نہ بیان کر دیا ہو۔ زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔ بڑے بڑے اہم مسائل کو اس طرح سمجھایا ہے کہ بچہ بھی ذہن نشین کر لے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اور اشعار میں بھی حقائق و معارف کا ایک خزانہ موجود ہے۔

کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد ۔۔۔ وز سِرّ قدر ہیچکس آگاہ نشد

ہر کس زسر قیاس چیزے گفتند ۔۔۔ معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد

عمر خیام (۱۱۲۴ء)

کس قدر قابل افسوس ہے یہ امر کہ عمر خیام جیسے حکیم اور شاعر کے حالات زندگی کی کوئی معتبر کتاب موجود نہیں۔ تیرہویں صدی سے سولہویں صدی تک کے تذکروں کی چھان بین سے بھی پورے واقعات نہیں ملتے۔ جو کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں غلط اور صحیح واقعات اس طرح مخلوط ہیں کہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے عمر خیام نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا۔ اس لئے غالباً لقب خیام قرار پایا۔ جب خیام، نظام الملک سے ملنے کے لئے گیا تو اس نے بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا اور نیشاپور کی گورنری کا عہدہ پیش کیا لیکن اس نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میں بنی نوع انسان پر حکومت نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے تو اتنا دیدیجئے کہ سکون کے ساتھ ایک

گوشۂ عافیت میں زندگی بسر کر سکوں۔ چنانچہ نظام الملک نے ایک ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

آج دنیا خیام کو ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب و تاریخ میں دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ اس زمانہ میں علمی لیاقت کے تکملہ کے لئے علم نجوم حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ خیام ایک اعلیٰ منجم بھی تھا۔ ملک شاہ نے ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا اور دور دور سے ہیئت داں اور منجم بلوائے۔ ان میں خیام بھی تھا۔ اس رصد میں جو زیچ تیار ہوئی وہ خاص خیام کی تیار کردہ تھی۔

خیام کی رباعیات میں دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب شراب کی تعریف اور توبہ و استغفار کے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضمون کو اس نے بار بار بیان کیا ہے۔ لیکن خیام کے حسن ادا اور ندرت بیان کا کمال یہ ہے کہ ایک مضمون جتنی دفعہ بیان کرتا ہے نیا لطف آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز بیان کرنا چاہتا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ عبرت، توبہ اور استغفار کے مضامین اس قدر موثر انداز میں بیان کئے ہیں کہ سننے والا بے اختیار ہو جاتا ہے۔ ذیل کی مثالوں میں اس اجمال کی تفصیل دیکھئے۔

دعائے مغفرت:- بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن — بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات رو من بخشائے — بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

مغفرت کا مطالبہ:- من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست — تاریک دلم نور صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی — آں بیع بود لطف و عطائے تو کجاست

خمریات:- من بے مے ناب زیستن نتوانم — بے جام کشید بار تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید — یک جام دگر بگیر و من نتوانم

فلسفۂ زندگی:- در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد | وز بہر نشست آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے | گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

اخلاق:- زاہد بہ زن فاحشہ گفتا مستی | ہر لحظہ بہ دام دیگرے پابستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم | تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

خیام کی تصنیفات میں زیچ ملک شاہی کے علاوہ ایک رسالہ طبیعیات پر ایک وجود کی حقیقت پر، اور ایک ایک رسالہ جبر و مقابلہ اور اقلیدس پر بھی ہے۔

شاید مشرقی شعراء میں صرف خیام ہی ایسا ہے۔ جس کی قدر و منزلت مشرق سے پہلے مغرب میں ہوئی۔ اس وقت یورپ میں خیام کی رباعیات کے جس قدر ترجمے مل سکتے ہیں، اور اس کے پرستاروں کی جتنی بڑی جماعت یورپ میں ہے۔ مشرق اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس کی رباعیات کے قدیم نسخے بھی آکسفورڈ اور پیرس ہی میں پائے جاتے ہیں۔

اس حکیم وقت نے ۱۱۲۴ء میں انتقال کیا۔ اس کی وفات کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک دن بوعلی سینا کی کتاب الشفاء دیکھ رہا تھا کہ وحدت و کثرت کا مسئلہ آیا۔ تو اٹھ کھڑا ہوا۔ نماز پڑھی وصیت کی۔ شام تک کچھ نہ کھایا عشاء کی نماز پڑھ کر سربسجود ہو کر دعا مانگی کہ "اے خدا جہاں تک ہو سکا تجھے پہچانا مجھے بخش دے" یہ کہہ کر جان، جان آفریں کے سپرد کی۔

(۴)

آخر دورِ سلجوقیہ

حکیم سنائی
۱۱۵۰ ـــ ۱۱۴۰

ابوالمجد مجدود نام اور سنائی تخلص تھا۔ غزنیں وطن تھا
اور سلطان بہرام شاہ غزنوی کے دربار سے وابستہ تھا
حکیم سنائی کی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب ہوا اور
اس کا محرک جو واقعہ ہے وہ نہ صرف اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ
اس نے سنائی کو سنائی بنایا۔ بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ ایکبار
دربار کو جاتے ہوئے اس نے ایک شراب خانے میں دیکھا کہ ایک مینخوار
یہ کہہ کر ساقی سے شراب مانگ رہا تھا کہ بہرام شاہ کے اندھے پن کے صدقہ
میں ایک جام پلا دے۔ ساقی نے کہا یہ تو کیا کہتا ہے وہ تو بڑا عقلمند بادشاہ ہے
اس نے جواب دیا کہ اپنے ملک کا انتظام ہوتا نہیں اور ہندوستان فتح
کرنے چلا ہے۔ پھر کہا کہ سنائی شاعر کے اندھے پن کا صدقہ میرا جام بھر دے
ساقی نے پھر پوچھا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ سنائی تو بڑا خوش گو شاعر ہے۔
اس نے جواب دیا واہ! اس سے زیادہ کیا اندھا پن ہو سکتا ہے کہ
وہ چند لایعنی باتیں نظم کر کے بے وقوف بادشاہ کے سامنے دولت کے
لالچ میں پڑھ دیتا ہے۔ اگر قیامت کے دن سوال ہوا کہ کیا تجھے
اسی ہرزہ سرائی کے لئے پیدا تھا کیا۔ جواب دے گا۔
سنائی یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس گفتگو کا اس پر اس قدر اثر

ہوا کہ جاہ و منصب دنیاوی کو چھوڑ کر برہنہ سر و برہنہ پا حج کو روانہ ہوا اور وہاں سے واپس آکر گوشہ نشین ہو گیا۔ اور ریاضت و عبادت میں زندگی بسر کرنے لگا۔

اس کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے:- ایک کلیات جو قصائد، غزلیات قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے اور اس میں تیس ہزار شعر ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی طریق التحقیق، غریب نامہ، سیر العباد، کرم نامہ، عقل نامہ، کارنامہ بلخ بہرو ز بہرام اور حدیقہ۔

حدیقہ سنائی کا کارنامہ زندگی ہے۔ اس میں دس باب ہیں جنمیں اسرار تصوف بیان کئے گئے ہیں۔

سنائی سے قبل ابو سعید ابوالخیر نے مسائل تصوف اپنی رباعیات میں بیان کئے۔ مگر وہ حقیقت میں اشارات تھے۔ اور وہ بھی جوش عشق پر مبنی۔ مگر حدیقہ میں تمام مقامات تصوف کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے پھر طرز ادا میں جدت، اور بیان میں شیرینی ہے۔ جس نے اس خشک مضمون کو رنگین بنا دیا ہے۔

سنائی کے کمال تصوف کو مولانا روم تک نے تسلیم کیا ہے۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما از پس سنائی و عطار آمدیم

معلم اخلاق کا منصب صرف اس شاعر کو دیا جا سکتا ہے جو مسلمات اور بدیہیات سے ایسے نتائج اخذ کرے جن تک عوام کی نگاہ نہ پہنچتی ہو اور کسی فعل کی ترغیب ایسے عنوان سے دے جو بالکل اچھوتا ہو۔ دیکھئے شراب کی مذمت کا کیا نیا پہلو نکالا ہے۔

نکند عاقل مستی نخورد دانا مے نہ نہد مردم ہشیار سوئے مستی پے

گر کنی بخشش گویند کہ مے کرد نہ او ور کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

فارسی شاعری میں جوش حافظ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن

دورِ متقدمین کے اس صوفی شاعر کا جام بھی مے سرجوش سے لبریز ہے دیکھئے الفاظ کی ترتیب، طرزِ ادا اور مضمون کی بلندی سے کس بلا کا جوش برستا ہے۔

طلب اے عاشقان خوش رفتار | طرب اے شاہدان شیریں کار
تا کے از خانہ ہاں رہِ صحرا | تا کے از کعبہ ہیں درِ خمار
درجہاں شاہدے و ما فارغ | در قدح جرعۂ و ما ہشیار

سنائی نے اپنی تعلیم کو قابلِ قبول بنانے کے لئے جا بجا نادر تشبیہات اور تمثیلات کا استعمال کیا ہے۔ جس سے اُن کا کلام بے حد موثر ہو گیا ہے

تو علم آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب | چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
چو تن جاں را مزین کن بعلم و دیں کہ زشت آید | درون سو شاہ عریان و بروں سو کوشک دیبا

امیر معزّی (۱۱۴۸ء)

محمد بن عبد الملک نام اور معزّی تخلص تھا۔ نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ برہانی الپ ارسلان کے دربار میں ملک الشعراء کے منصب پر فائز تھا۔ الپ ارسلان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا مگر برہانی کا اعزاز اسی طرح باقی رہا۔ باپ نے اپنے انتقال سے قبل بیٹے کی شاہ سے ان الفاظ میں سفارش کی:-

من رفتم و فرزند من آمد خلف صدق | اور ا بخدا و بخداوند سپردم

برہانی کی یہ سفارش قبول ہوئی اور امیر معزّی اسی تنخواہ اور عہدہ پر مامور کر دیا گیا۔ لیکن اس کو حقیقی مرتبہ اور اعزاز شاہ سنجر کے دربار میں حاصل ہوا۔ تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے عہد کا سب سے زیادہ متمول شاعر تھا۔

بدیہہ گوئی میں کمال تھا۔ پھر سنجر کی قدر دانی نے اس کے دل کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس لئے جو کچھ کہا ہے وہ انتخاب ہی انتخاب ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے عید کا چاند دیکھا۔ اور معزّی کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے

بے ساختہ کہا:۔

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی	یا ہمچو کمانِ شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زرِ عیاری گوئی	در گوش سپہر گوشواری گوئی

اور ایک گھوڑا اور پانچ ہزار درہم انعام میں حاصل کئے۔

صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ اس کی غزل میں فرخی کا رنگ اور قصیدہ میں عنصری کا رنگ غالب ہے۔ کلام میں پختگی کے ساتھ ساتھ رنگینی اور نازک خیالی پائی جاتی ہے۔ نئے نئے استعارات اور تشبیہات بھی بکثرت موجود ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے اکثر اسی کی ایجاد ہیں۔ اس لئے اور زیادہ لطیف معلوم ہوتے ہیں۔

ایک جگہ بہار کے ساتھ ہجر معشوق میں اپنی کلفت کا حال کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

اگرچہ خرمی عالم از بہار بود	ہمیشہ خرمی من ز روئے یار بود
سرشک ابر گر افزوں بود بوقت بہار	سرشک من بدل ہر یکے ہزار بود

موسم بہار ہے۔ ایک طرف ابر بہار رو رہا ہے۔ دوسری طرف عاشق ہجراں نصیب لیکن دونوں کے اشکوں کا فرق دیکھئے۔

بخارِ آب ہمہ دُر فشاں بود زہوا	بخار عشق ز چشم عقیق بار بود

تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور جدت دیکھئے!

عاشق آنم کہ غالبش ہمی بار د شکر	فتنۂ آنم کہ سنجابش ہمی پوشد حجر
خستۂ آنم کہ از گل تودہ دارد بر سمن	لبتۂ آنم کہ از شب حلقہ دارد بر کمر

اسکی وفات کے متعلق ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ شکار میں تھا۔ ایک تیر اتفاقاً اس کے لگا۔ اور اس کے زخم سے جاں بر نہ ہو سکا لیکن بعض تذکروں میں یہ شعر درج ہے۔ جو اس نے اس زخم سے اچھا ہو کر بطور تشکریہ کے کہا تھا۔

منت خدائے را کہ بہ تیر خدائگاں	من بندہ بے گنہ نشدم کشتہ رائگاں

بہر حال اس کا انتقال سنہ ۱۱۴۸ء میں ہوا۔

نظامی عروضی سمرقندی نجم الدین احمد بن عمرؓ بن علیؓ پورا نام تھا۔ سمرقند کا رہنے والا تھا۔ نظامی تخلص تھا۔ اوّلاً ملک الجبال غوری کے دربار سے وابستہ تھا۔ نظامی عروضی کے حالاتِ زندگی بیشتر اس کی کتاب چہار مقالہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تاریخ ولادت و وفات نہیں معلوم ہوتی۔

اسی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۱۱۰ء میں وہ سمرقند میں تھا۔ سنہ ۱۲-۱۱۱۳ء میں نیشاپور گیا۔ اور خیام سے استفادہ کیا۔ طوس میں جاکر فردوسی کی قبر کی زیارت کی۔ سنہ ۱۱۱۶ء میں جب نیشاپور پہنچا تو خیام کا انتقال ہو چکا تھا سنہ ۱۱۱۷ء میں امیر معزی کے ذریعہ سے سلطان سنجر کے دربار میں باریابی حاصل کی اور موردِ انعام و اکرام ہوا۔

نظامی عروضی کی شہرت اس کی مشہور کتاب چہار مقالہ سے ہے۔ یہ شعرائے ایران کا ایک نہایت موقر تذکرہ ہے۔ اور آج جتنے تذکرے نظر آتے ہیں۔ ان میں مشکل سے کوئی ایسا نکلے گا۔ جس کا ماخذ چہار مقالہ نہ ہو محققین متفق ہیں کہ یہ تذکرہ تاریخی اور تنقیدی اعتبار سے بہت معتبر ہے۔ اس کتاب میں علاوہ شعراء اور مصنفین کے حالات کے مختلف خاندانوں کے بادشاہوں کے حالات بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۱۵۵ء میں لکھی گئی۔ اس کی عبارت بہت دلچسپ اور رنگین ہے۔ اور طرز ادا میں اعتماد اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔

نظامی عروضی شاعر بھی تھا۔ اور شاعری میں اس کا مرتبہ نثر نگاری سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لیکن تذکرہ نویسوں نے صرف اس کے چند اشعار محفوظ رکھے ہیں۔

ہوا کہ جاہ و منصب دنیاوی کو چھوڑ کر برہنہ سر و برہنہ پا حج کو روانہ ہوا اور وہاں سے واپس آ کر گوشہ نشین ہو گیا۔ اور ریاضت و عبادت میں زندگی بسر کرنے لگا۔

اس کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے:- ایک کلیات جو قصائد، غزلیات قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے اور اس میں تیس ہزار شعر ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی طریق التحقیق، غریب نامہ، سیر العباد، کرم نامہ، عقل نامہ، کارنامہ بلخ بہروز بہرام اور حدیقہ۔

حدیقہ سنائی کا کارنامہ زندگی ہے۔ اس میں دس باب ہیں جن میں اسرار تصوف بیان کئے گئے ہیں۔

سنائی سے قبل ابو سعید ابو الخیر نے مسائل تصوف اپنی رباعیات میں بیان کئے۔ مگر وہ حقیقت میں اشارات تھے۔ اور وہ بھی جوش عشق پر مبنی۔ مگر حدیقہ میں تمام مقامات تصوف کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے پھر طرز ادا میں جدت، اور بیان میں شیرینی ہے۔ جس نے اس خشک مضمون کو رنگین بنا دیا ہے۔

سنائی کے کمال تصوف کو مولانا روم تک نے تسلیم کیا ہے۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما در پس سنائی و عطار آمدیم

معلم اخلاق کا منصب صرف اس شاعر کو دیا جا سکتا ہے جو مسلمات اور بدیہیات سے ایسے نتائج اخذ کرے جن تک عوام کی نگاہ نہ پہنچتی ہو اور کسی فعل کی ترغیب ایسے عنوان سے دے جو بالکل اچھوتا ہو۔ دیکھئے شراب کی مذمت کا کیا نیا پہلو نکالا ہے۔

نکند عاقل مستی نخورد دانا مے نہ نہد مردم ہشیار سوئے مستی پے

گر کنی بخشش گویند کہ مے کرد نہ او ور کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

فارسی شاعری میں جوش حافظ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن

دورِ متقدمین کے اس صوفی شاعر کا جام بھی مے سرجوش سے لبریز ہے دیکھئے الفاظ کی ترتیب، طرزِ ادا اور مضمون کی بلندی سے کس بلا کا جوش برستا ہے۔

طلب اے عاشقان خوش رفتار — طرب اے شاہدان شیریں کار
تا کے از خانہ، ہاں رہِ صحرا — تا کے از کعبہ ہین درِ خمار
در جہاں شاہدے و مافارغ — در قدح جرعۂ و ما ہشیار

سنائی نے اپنی تعلیم کو قابلِ قبول بنانے کے لئے جا بجا نادر تشبیہات اور تمثیلات کا استعمال کیا ہے۔ جس سے آن کا کلام بے حد موثر ہو گیا ہے

تو علم آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب — چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
چو تن جاں را مزین کن بہ علم و دیں کہ زشت آید — دروں سو شاہ عریاں و بروں سو کوشک دیبا

امیر معزی (۱۱۴۸ء)

محمد بن عبد الملک نام اور معزی تخلص تھا۔ نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ برہانی الپ ارسلان کے دربار میں ملک الشعراء کے منصب پر فائز تھا۔ الپ ارسلان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا مگر برہانی کا اعزاز اسی طرح باقی رہا۔ باپ نے اپنے انتقال سے قبل بیٹے کی شاہ سے ان الفاظ میں سفارش کی:-

من رفتم و فرزند من آمد خلف صدق — او را بخدا و بخداوند سپردم

برہانی کی یہ سفارش قبول ہوئی اور امیر معزی اسی تنخواہ اور عہدہ پر مامور کر دیا گیا۔ لیکن اس کو حقیقی مرتبہ اور اعزاز شاہ سنجر کے دربار میں حاصل ہوا۔ تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے عہد کا سب سے زیادہ ہمنول شاعر تھا۔

بدیہہ گوئی میں کمال تھا۔ پھر سنجر کی قدر دانی نے اس کے دل کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس لئے جو کچھ کہا ہے وہ انتخاب ہی انتخاب ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے عید کا چاند دیکھا۔ اور معزی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے

بے ساختہ کہا:۔

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی | یا ہمچو کمانِ شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زرِ عیاری گوئی | در گوش سپہر گوشواری گوئی

اور ایک گھوڑا اور پانچ ہزار درہم انعام میں حاصل کئے۔

صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ اس کی غزل میں فرخی کا رنگ اور قصیدہ میں عنصری کا رنگ غالب ہے۔ کلام میں پختگی کے ساتھ ساتھ رنگینی اور نازک خیالی پائی جاتی ہے۔ نئے نئے استعارات اور تشبیہات بھی بکثرت موجود ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے اکثر اسی کی ایجاد ہیں۔ اس لئے اور زیادہ لطیف معلوم ہوتے ہیں۔

ایک جگہ بہار کے ساتھ ہجر معشوق میں اپنی کلفت کا حال کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

اگرچہ خرمی عالم از بہار بود | ہمیشہ خرمی من زروئے یار بود
سرشک ابر گرافزوں بود بوقت بہار | سرشک من بدل ہر یکے ہزار بود

موسم بہار ہے۔ ایک طرف ابر بہار رو رہا ہے۔ دوسری طرف عاشق ہجراں نصیب لیکن دونوں کے اشکوں کا فرق دیکھئے۔

بخارِ آب ہمہ دُرفشاں بود زہوا | بخار عشق ز چشمم عقیق بار بود

تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور جدت دیکھئے۔

عاشق آنم کہ غالبش ہمی بار د شکر | فتنۂ آنم کہ سنجالبش ہمی پوشد جگر
خستۂ آنم کہ از گل تودہ دارد برسمن | لبتۂ آنم کہ از شب حلقہ دارد بر کمر

اسکی وفات کے متعلق ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ شکار میں تھا۔ ایک تیر اتفاقاً اس کے لگا۔ اور اس کے زخم سے جاں بر نہ ہو سکا لیکن بعض تذکروں میں یہ شعر درج ہے۔ جو اس نے اس زخم سے اچھا ہو کر بطور تشکریہ کے کہا تھا۔

منت خدائے را کہ بہ تیر خدایگاں | من بندہ بے گنہ نشدم کشتہ رائگاں

بہرحال اس کا انتقال ۱۱۴۸ء میں ہوا۔

نظامی عروضی سمرقندی | نجم الدین احمد بن عمرؓ بن علیؓ پورا نام تھا۔ سمرقند کا رہنے والا تھا۔ نظامی تخلص تھا۔ اوّلاً

ملک الجبال غوری کے دربار سے وابستہ تھا۔ نظامی عروضی کے حالاتِ زندگی بیشتر اس کی کتاب چہار مقالہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تاریخ ولادت و وفات نہیں معلوم ہوتی۔

اسی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۱۰ء میں وہ سمرقند میں تھا۔ ۱۱۱۳-۱۱۱۲ء میں نیشاپور گیا۔ اور خیام سے استفادہ کیا۔ طوس میں جاکر فردوسی کی قبر کی زیارت کی۔ ۱۱۱۶ء میں جب نیشاپور پہنچا تو خیام کا انتقال ہو چکا تھا ۱۱۱۸ء میں امیر معزی کے ذریعہ سے سلطان سنجر کے دربار میں باریابی حاصل کی اور موردِ انعام و اکرام ہوا۔

نظامی عروضی کی شہرت اس کی مشہور کتاب چہار مقالہ سے ہے۔ یہ شعرار ایران کا ایک نہایت موقر تذکرہ ہے۔ اور آج جتنے تذکرے نظر آتے ہیں۔ ان میں مشکل سے کوئی ایسا نکلے گا۔ جس کا ماخذ چہار مقالہ نہ ہو محققین متفق ہیں کہ یہ تذکرہ تاریخی اور تنقیدی اعتبار سے بہت معتبر ہے۔ اس کتاب میں علاوہ شعراء اور مصنفین کے حالات کے مختلف خاندانوں کے بادشاہوں کے حالات بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۵۵ء میں لکھی گئی۔ اس کی عبارت بہت دلچسپ اور رنگین ہے۔ اور طرز ادا میں اعتماد اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔

نظامی عروضی شاعر بھی تھا۔ اور شاعری میں اس کا مرتبہ نثر نگاری سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لیکن تذکرہ نویسوں نے صرف اس کے چند اشعار محفوظ رکھے ہیں۔

انوری (۱۱۸۶)

اوحدالدین محمد نام اور انوری تخلص تھا۔ ابیورد میں پیدا ہوا منصوریہ کالج طوس میں تعلیم حاصل کی اور نجوم، اقلیدس، منطق، موسیقی ریاضی، اخلاق اور علم ہئیت میں خاص دستگاہ رکھتا تھا۔

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ایک بار وہ مدرسہ کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ کہ سامنے سے ایک شخص بڑی شان و شوکت سے گزرا۔ خود ایک تازی گھوڑے پر سوار تھا۔ بیش قیمت لباس زیب تن تھا۔ اور غلام رکاب میں تھے۔ انوری نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ دربار شاہی کا شاعر ہے۔ یہ سن کر انوری نے کہا "سبحان اللہ" پایۂ علم بایں بلندی و من چنیں مفلوک و شیوۂ شاعری بایں پستی و ایں مرد چنیں محترم۔ بعزو جلال کہ بعد الیوم بہ شاعری کہ دون مرتبۂ من است مشغول شوم" اسی رات کو انوری نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :-

گر دل و دست بحر و کاں باشد   دل و دست خدا ئگاں باشد

صبح کو قصیدہ بسر دربار سلطان سنجر کے سامنے پیش کیا۔ انعام و اکرام حاصل کیا اور شعراء دربار میں داخل ہو گیا۔

انوری صرف شاعر ہی نہیں بلکہ عالم بھی تھا۔ دستور زمانہ کے مطابق نجوم میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے یہ پیش گوئی کی کہ فلاں تاریخ میں سبعہ سیارہ برج میزان میں جمع ہوں گے۔ اس لئے ملک میں سخت آندھیاں چلیں گی۔ اور ان سے مکانات اور پیڑ گر جائیں گے۔

عوام اس پیش گوئی کو سن کر اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ انھوں نے حفاظتِ جان کے لئے تہہ خانے تیار کئے اور جب وقت مقررہ آپہنچا تو اُن تہہ خانوں میں چھپ گئے۔ لیکن اس رات کو آندھی تو کیا ہوا تک بند رہی اور سر مینار جلنے والے چراغ تک گل نہ ہوئے۔ یہ صورت دیکھ کر انوری نے کہا کہ ستاروں کے اس اجتماع کا اثر دوران سال میں کسی نہ کسی وقت ضرور ظاہر ہو گا۔ لیکن سارا سال گزر گیا۔ اور ایک مرتبہ بھی

تیز ہوا تک نہ چلی۔ یہ واقعہ ۵۸۵ھ یا بقول ابن اثیر ۵۸۶ھ کا ہے۔
شاہ نے انوری کو دربار میں طلب کیا۔ اور غلط پیشین گوئی سے رعایا کو
خوف زدہ کرنے پر عتاب کیا۔ انوری شاہی غضب سے ڈر کر بھاگ
نکلا اور بلخ پہنچا۔ لیکن بدقسمتی ساتھ گئی۔ بلخ میں ایک ہجو مشہور تھی جس میں
شہر بلخ کو بدمعاشوں اور اوباشوں کا مسکن بتایا گیا تھا۔ اصل میں تو یہ
ہجو سوزنی کی لکھی ہوئی تھی۔ لیکن انوری کے دشمنوں نے اس کی طرف
منسوب کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل شہر نے اسے زنانہ لباس پہنا کر تمام
شہر میں گشت کرایا اور اس سے بھی زیادہ ذلیل کرنے کا ارادہ تھا۔
لیکن قاضی حمید الدین، سید ابو طالب اور مفتی سیف الدین نے دستگیری
کی اور مزید ذلت سے بچا لیا۔ انوری کا انتقال بلخ میں ۵۸۶ھ میں ہوا۔

انوری قصیدہ کا شاعر تھا اور اس کا کمال اسی صنف شاعری تک
محدود ہے۔ قصائد میں بجز امور ملکی و سیاسی اور معاشرت وغیرہ کا
برابر ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ کا مطلع ہے۔

اے مسلمانان فغاں از دور چرخ چنبری   وز نفاق تیر و کید ماہ و قصد مشتری

ایک قصیدہ میں افلاطون کے فلسفہ تقسیم عمل کو بیان کیا ہے۔ اور بتایا ہے
کہ ہر صاحب فن خواہ وہ چمار ہو یا جوہری، سوسائٹی میں ایک امتیازی
جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اسی قصیدہ میں شعر گوئی کو کار ہوس پیشگان بنا کر
قابل مذمت گردانا ہے۔ بعض تاریخی واقعات مثلاً سلطان سنجر کی
گرفتاری کے زمانہ کی بدامنی کو نظم میں لکھا ہے۔ عوام کے اخلاق کو درست
کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی فرضی حکائیتیں لکھی ہیں۔ غرض جہاں تک
مضمون کا تعلق ہے اس نے اپنے کلام کو مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔

روبہے می دوید در غم جاں   روبہے دیگرش بدید چناں
گفت خیر است باز گوئی خبر؟   گفت خر گیری کند سلطاں
گفت تو خر نہ چہ می ترسی   گفت آرے ولیک آدمیاں
می ندانند فرق می نہ کنند   خر و روباہ شان بود یکساں

انوری نے زبان سے ثقیل اور گراں الفاظ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس ظاہری خوبی کی جگہ بلند تخئیل، خوبصورت تراکیب، نادر تشبیہات اور شیرینیٔ زبان سے کلام کو مزین کیا ہے۔ اس کے مضامین میں جدت بھی پائی جاتی ہے۔ مسلمات کے لئے نئے شاعرانہ وجوہ اختراع کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ مثالیں دیکھئے:۔

ممدوح کی تعریف:۔ درجہانی و از جہاں بیشی | ہمچو معنی کہ در میاں باشد

تشبیہات:۔ دوش سلطان چرخ آئینہ فام | آنکہ دستور شاہ راست غلام

ازکنار نبرد گاہِ افق | چوں بہ دست غروب داد زمام

دیدم اندر سوادِ طرۂ شب | گوشوارِ فلک زگوشۂ بام

گفتم آں نعل خنگ دستور است | قرۃ العین و فخر آل نظام

اس کے کلام میں روانی، سلاست اور برجستگی بھی ہے۔ تکلف کی مذمت کرتا ہے:۔

تکلف میانِ دو آزاد مرد | بود ناپسندیدہ و سخت کام

بیا تا تکلف بیک سو نہیم | نہ از تو رکوع و نہ از ما قیام

بہ سنت کنم اقتدا زیں سپس | سلامٌ علیکم علیکم سلام

انوری کو فارسی شاعری کے تین پیغمبروں میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے

درشعر سہ تن پیمبرانند | ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را | فردوسی و انوری و سعدی

انوری اپنے معاصرین عبدالواسع اور رشیدالدین وطواط میں سب سے بہتر تھا۔ اس کو ہر صنف پر قدرت حاصل تھی۔ حتیٰ کہ جب ہجو کہتا تو بھی کلام میں سیلاب کی روانی ہوتی تھی۔

خاقانی
۱۱۰۶—۱۱۸۵

افضل الدین ابراہیم بن علی نام تھا۔ گنجہ کے مقام پر ۱۱۰۶ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا اور زمانہ کے مشہور طبیب مرزا کافی بن عثمانی سے حاصل کی۔ علاوہ

عربی اور فارسی زبان کے فلسفہ، طب اور نجوم وغیرہ میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ ۲۵ سال کی عمر میں اُس کے شفیق چچا کا انتقال ہو گیا۔ اور اُسکی تعلیم کا سلسلہ دفعتاً ختم ہو گیا۔ منوچہر شروان شاہ کے درباری شاعر

ابو العلا گنجوی نے خاقانی کی لیاقت اور اہلیت دیکھ کر فن شعر کی تعلیم دی شروع میں حقایقی تخلص اختیار کیا۔ لیکن بعد میں شاہ خاقان منوچہر کی قدردانی کی یادگار کے طور پر بدل کر خاقانی رکھا۔ ابو العلا گنجوی نے علاوہ ان مراعات کے خاقانی کو اپنا داماد بنایا۔ لیکن اُس نے دربار میں مرتبہ حاصل کرتے ہی اپنے اُستاد اور محسن کو بُرا کہنا شروع کیا۔ اور اُس کی شان میں نہایت فحش ہجو لکھی۔ خاقانی کبھی ایک قدردان پر قانع نہیں رہا۔ اور ہمیشہ اس کی یہ تمنا رہی کہ سلطان سنجر اور شہزادگان خوارزم شاہی کے دربار میں جگہ حاصل کرے۔ اسی لئے اس نے ان بادشاہوں کی مدح میں قصیدے بھی لکھے ہیں۔

خاقانی دو مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوا۔ دوسرے سفر کے مفصل حالات مشہور مثنوی تحفۃ العراقین میں نظم کئے ہیں۔

جب شروان شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ خاقانی دوسرے درباروں میں جانا چاہتا ہے۔ تو اس نے غصہ میں آکر اسے قید کرا دیا۔ اس قید و بند کے زمانہ میں اس نے چند قصائد "حبسیات" کے نام سے لکھے۔ قید سے رہائی کے بعد درباری زندگی سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ اور ۱۱۸۵ء میں انتقال کیا۔

خاقانی بہت پرگو شاعر تھا۔ بے شمار قصائد ایک ضخیم دیوان اور ایک مثنوی تحفۃ العراقین یادگار ہیں۔

پروفیسر براؤن نے اس کے متعلق لکھا ہے "اس کے کلام میں حد سے زیادہ تصنع اور نمایش پائی جاتی ہے"۔ اس کا کلام مختلف علوم کی اصلاحات مقامات، تصوف کی طرف اشارات، تاریخی تلمیحات، اور مشکل تراکیب

سے لبریز ہے۔

خاقانی کو جدید استعارات اور تشبیہات پیدا کرنے میں ملکہ ہے۔ لیکن بعض مقامات پر اس کے استعارے مشکل ہو جاتے ہیں۔ نہایت قادر الکلام اُستاد تھا۔ اشعار میں بلا کا جوش اور روانی ہے۔ اور لمبے لمبے قصیدوں میں بھی زورِ بیان از اوّل تا آخر بدستور قائم رہتا ہے۔ ایک قصیدہ قیصر روم کو قید سے رہائی کی سفارش کے لئے بھیجنا چاہتا تھا اس میں تمام اصطلاحات مذہب عیسوی سے متعلق ہیں۔

فلک کج رو تر است از خطِ ترسا — مرا دارد مسلسل راہب آسا
نہ روح اللہ برین دیر ست چون شد — چنیں دجّال فعل این دیر مینا
تنم چون رشتۂ مریم دو تا ہست — دلم چون سوزن عیسیٰ است یکتا
من اینجا پائے بندِ رشتہ ماندم — چو عیسیٰ پائے بند سوزن آنجا

اسی طرح ایک دوسرے قصیدہ میں تصوف کی اصطلاحات بیان کی ہیں۔

کسے کین خضر معنی راست دامن گیر چون موسیٰ — کف موسیٰ و آب خضر بینی در گریبانش
ہمہ تلقینش آیاتے کہ خاموشیست تاویلش — ہمہ تعلیمش اشکالے کہ نادانیست برہانش
مرا بر لوح خاموشی الف با تا نوشت اوّل — کہ در دسر زبان ست و ز خاموشیست درمانش

تلمیحات:۔ سلیمانی است این ہمت بملکِ خاص درویشی
کہ گوش رب ہب لی میز نند از پیش ایوانش

مرا دل گفت گنج فقر داری در جہان منگر
نعیم مصر دیدہ کس چہ باید قحط کنعانش

روزہ کردم نذر چون مریم کہ ہم مریم صفات — خاطر روح القدس پیوند عیسیٰ زائے من

نہ خود سلطان درویشان خاص ست احمد مرسل
کہ از نون والقلم طغر است بر منشور فرقانش

شاعراں را گرچہ غاوون خواند در قرآن خدا
ہم از ایشان بود ظاہر وجہ استہزائے من

خاقانی اپنے اس عالمانہ رنگ کا ایسا منفرد شاعر ہے کہ متوسطین و متاخرین باوجود سعیٔ بلیغ کے بھی اس کے قصیدوں کے جواب میں اس سے بہتر نہ کہہ سکے۔

---

(۵)

ماقبل دورِ منگولیہ

نظامی گنجوی (۱۲۰۳—۱۱۴۱ء)

ابو محمد نظام الدین الیاس یوسف بن ذکی مویدنام اور نظامی تخلص تھا۔ گنجہ میں ۱۱۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ والد اور والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے ایک عزیز نے بارِ کفالت اپنے سر لے لیا تھا۔ نظامی کا تعلق ایک ذی علم خاندان سے تھا۔ اُن کے بڑے بھائی قوامی مطرزی مشہور شاعر تھے۔

اُن کا ایک قصیدہ جس میں تمام صنائع جمع ہیں۔ بہت مشہور ہے۔ ابتدا میں نظامی نے علوم درسیہ کی تحصیل کی۔ طبیعت کو تصوف سے دلی لگاؤ تھا ایک سلسلہ طریقت میں بیعت بھی تھے۔ تحصیل علوم سے فارغ ہو کر شاعری کی طرف توجہ کی اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ ۱۲۰۳ء میں وفات پائی۔

نظامی کی شہرت کا انحصار پنج گنج یا خمسۂ نظامی پر ہے۔ یہ پانچ مثنویاں ہیں۔ جو مختلف بحروں میں لکھی گئی ہیں۔ ان مثنیوں میں رزم اور بزم دونوں ہیں۔

(۱) مخزن الاسرار ۱۱۷۶ء میں لکھی گئی۔ اور سلطان محمد ایلدگز کے نام معنون کی گئی۔

(۲) خسرو شیریں ۱۱۷۶ء میں نظم کی گئی۔ اور سلطان محمد اور قزل ارسلان کے نام سے منسوب کی گئی۔

(۳) لیلیٰ مجنوں ۱۱۸۹ء میں تصنیف ہوئی اور منوچہر شروان شاہ کو پیش کی۔

(۴) سکندر نامہ ۱۱۹۱ء میں مکمل ہوا۔ عزیز الدین مسعود اوّل کے نام

سے وابستہ ہوا۔

(۵) ہفت پیکر ۱۱۹۹ء میں اختتام پذیر ہوئی۔ اور نصرت الدین ابو بکر کے نام معنون کی گئی۔

نظامی گنجوی کا کلام اُن کے کردار کا آئینہ دار ہے۔ خود بڑے خود دار، صاحب دل، اور باخدا تھے۔ اُنھوں نے اپنے قصائد کو سلاطین اور امرار کی بے جا اور خوشامدانہ تعریف سے ملوث نہیں ہونے دیا۔

نظامی مثنوی میں فردوسی کے ہم پلہ اور رزم بزم کے یکساں اُستاد ہیں یہ خیال کہ اُن کا رتبہ فردوسی سے بہت کم تھا اور نظامی اور فردوسی کا موازنہ شیر و روباہ کا مقابلہ ہے۔ بالکل غلط اور متعصبانہ خیال ہے۔

نظامی نے غزل کا کوئی دیوان نہیں چھوڑا۔ لیکن اُن کی جو جستہ جستہ غزلیں ملتی ہیں۔ اُن میں رنگ تغزل پھیکا ہے۔ مگر اس پر بھی اُن میں شوخی اور ظرافت کی دبی ہوئی چنگاریاں موجود ہیں۔

شنیدم عاشقاں را می نوازی گر بمن زاں میان بیرونم اے دوست
پیش تو کردہ ام عیاں حال تباہ خویش را تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را

سرزنشم مکن کہ تو شیفتہ تر زمن شوی گر نگری در آئینہ روئے چو ماہ خویش را

بوسہ می خواہم ازاں لب تو چہ می فرمائی گر صواب است بگو ورنہ خطائے بکنم

نظامی کے کلام میں جوش، بلندی، اور زور ہے۔ اور تراکیب چست ہیں مثنوی کی زبان کا روزمرہ ہونا بہت ضروری ہے۔ اسی لئے فردوسی نے خالص فارسی لکھنے کی کوشش کی تھی۔ نظامی کے زمانہ میں عربی الفاظ روزمرہ میں اس طرح شامل تھے کہ اُن کا ترک زبان کو غیر فصیح بنا دیتا۔ اس لئے نظامی کی زبان فردوسی سے مختلف مگر بالکل فصیح اور نہایت پُر زور ہے۔

انقلاب زمانہ:—

فلک بر بلندی، زمیں پر مغاک یکے طشت خوں شد، یکے طشت خاک
نوشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت زخون سیاوش بلیسے سر نوشت

شاعری کی روح، شاعر کی قوت تخئیل ہے۔ اگر اس میں ذراسی بھی کمی ہے۔ تو زبان کی سادگی اور شیرینی، الفاظ کے حسن، تراکیب کی چستی استعارات اور تشبیہات سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

علم بر کش اے آفتابِ بلند خراماں شو اے ابر شکیں پرند
بیار اے ہوا قطرۂ ناب را بگیر اے صدف دُر کن آں آب را
برآ اے دُر از قعر دریائے خویش بہ تاج سر شاہ کن جائے خویش

استعارات اور تشبیہات:— سکندر نے دارا کی تڑپتی ہوئی لاش کو اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ صرف ایک استعارے سے کیا مکمل نقشہ پیش کرتے ہیں۔

سر خستہ را بر سراں نہاد شب تیرہ بر روز رخشاں نہاد

سکندر نے دارا کو اس کی شانِ کے خلاف جواب دیا۔ دارا اس کو سُن کر کہتا ہے۔

ازاں ابر عاصی چناں ریزم آب کہ نارد دگر دست بر آفتاب

سکندر نامہ میں نظامی نے جہاں بانی اور پیغمبری کے متعلق فلسفیانہ بحثیں کی ہیں اور نہایت تفصیل سے کام لیا ہے۔ یہ تمام بحثیں اگرچہ خالص علمی ہیں۔ مگر بالکل عام فہم زبان میں پیش کی ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت، معاملاتِ عشق اور وعظ و نصیحت تمام مضامین کو پورے، اعتماد اور خوبی سے ادا کیا ہے۔

سکندر نامہ ہر اعتبار سے نہایت مکمل رزمیہ نظم ہے۔ خود مولانا شبلی، باوجود فردوسی کے بے طرح مداح ہونے کے اس اعتراف پر مجبور ہیں۔ "فصاحت و بلاغت، تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور لطافت، الفاظ کی شان و شوکت، ان تمام باتوں نے اس داستان کو سحر سامری بنا دیا ہے۔" "ساقی نامہ" کی اختراع کا سہرا بھی نظامی کے سر ہے۔

ظہیر فاریابی
۱۱۵۵ — ۱۲۰۲

ظہیر فاریابی محمد بن طاہر، ظہیر ۱۱۵۵ء میں فاریاب کے مقام پر پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ رشیدی سمرقندی کا شاگرد تھا۔ تعلیم سے فراغت حاصل کر کے ظہیر سیاحت کے لئے روانہ ہوا۔ اور نیشاپور، ماژندران، عراق، آذربائیجان، اور اصفہان کی سیر اور مختلف امرا، اور سلاطین کی مدح سرائی کرتا رہا۔ ظہیر فاریابی کے ممدوحین کی فہرست بہت طویل ہے۔ جن میں سے چند خاص یہ ہیں:—
حسام الدولہ اردشیر بن حسن اسپہبد ماژندران، طغان شاہ بن مؤید اتابک قزل ارسلان، محمد بن یلدگز، شروان شاہ، نصرت الدین ابوبکر بن محمد طغرل بن ارسلان، اور صدر خجند،

آخر عمر میں درباری زندگی سے اُکتا کر عزلت گزیں ہو گیا، اور ۱۲۰۲ء میں تبریز میں انتقال کیا۔ اور سرخاب میں خاقانی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔
ظہیر کے متعلق کسی کا یہ شعر بہت مشہور ہے:—

دیوان ظہیر فاریابی — در مکہ بدزد اگر بیابی

اگرچہ ظہیر کو خاقانی، انوری اور نظامی کے مقابلے میں پیش کرنا دشوار ہے لیکن پھر بھی یہ بڑی بے انصافی ہے کہ اس کو محض ایک معمولی قصیدہ گو کہہ کر تنقید ختم کر دی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے صنف قصیدہ کو شوخیٔ بیان اور شیرینی ادا سے جلا کی۔ اس کی زبان اور طرز ادا مضمون کے مطابق ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے اکثر قصائد صاف، سلیس اور رواں ہیں لیکن جہاں مضمون کی بلندی دقت زبان چاہتی ہے۔ وہاں وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ وہ آورد سے دور رہ کر مشکل مضمون کو شاعرانہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ظہیر کے کلام میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ قصیدے کے قصیدے پڑھ جائیے۔ یہ نہ ہوگا کہ بعض اشعار نہایت بلند اور بعض نہایت پست ہیں۔ ایک خاص معیار ہے جس میں کمی نہیں ہوتی۔ تخیل کی بلند پروازی اور تشبیہات کی ندرت بھی موجود ہے۔ دیکھئے ایک قصیدہ کی تشبیب میں

ماہِ نو کی تشبیہات بیان کرتا ہے۔

چوں بر فلک طلیعۂ شب گشت آشکار | آفاق ساخت کسوت عباسیانِ شعار
پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسماں | شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار
روئے فلک چو لجۂ دریا و ماہِ نو | مانند کشتئے کہ ز دریا کند گزار
یا بر مثال ماہیِ یونس میانِ آب | آہنگ در کشیدنِ او کردہ از کنار
یا ہمچو یونس آمدہ بیروں ز بطنِ حوت | افتادہ بر کنارۂ دریا نحیف و زار

دیکھیے تخیل کے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں۔

زبان پر اس قدر قدرت حاصل ہے کہ مشکل ردیف ہو یا سنگلاخ زمین

ہر مقام پر دریا کی سی روانی پیدا کر دیتا ہے۔

تراست لعلِ شکر بار و درمیاں گوہر | میانِ لعل چرا کردۂ نہاں گوہر
بخندہ، چوں لبِ یاقوت رنگ کشائی | ز شرمِ زرد شود ہمچو زعفراں گوہر
اگرچہ سیم و زرم نیست ہست گوہر نفس | کہ نزدِ عقل بہ از صد ہزار کاں گوہر

خواجہ عطار
۱۱۱۶ — ۱۲۳۰ء

آپ کا پورا نام خواجہ فرید الدین ابو طالب محمدؒ بن ابو بکر تھا لیکن دنیائے علم میں آپ اپنے تخلص عطار سے پہچانے جاتے ہیں۔ پیشہ عطاری و طبابت تھا۔ ایک عظیم الشان دواخانہ اور نہایت کامیاب مطب تھا۔ جس میں روزانہ تقریباً ۵۰۰ مریض آتے تھے۔ صاحب دل صوفی تھے۔ اور تصوّف کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ دواخانہ کے زمانہ میں ہی تصوّف پر کئی رسالے تصنیف کئے جن کا ذکر خود ان اشعار میں کیا ہے۔

مصیبت نامہ کاندوہ جہاں است | الٰہی نامہ کاسرار عیاں است
بدارو خانہ ہر دو کردم آغاز | چہ گویم زود رستم زین و آں باز

خواجہ کا دل عشقِ الٰہی سے لبریز تھا۔ معرفت و حقائق کی روشنی نے دل و دماغ کو روشن کر دیا تھا۔ دل دنیا سے بیزار ہو چکا تھا۔ صرف ایک بہانہ کی ضرورت تھی کہ دنیا چھوڑ دیں۔ اتفاقاً ایک دن ایک فقیر دواخانہ کے

سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور دوکان کے ساز و سامان کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ خواجہ صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ آپ نے اُسے منع کیا۔ فقیر یہ سن کر بولا۔ "لو بابا ہم جاتے ہیں۔ تم اپنی فکر کرو" یہ کہہ کر زمین پر لیٹ گیا اور جان دیدی۔ اس واقعہ نے اُن کے دل پر بڑا اثر کیا۔ کھڑے کھڑے دواخانہ لٹا دیا۔ اور جنگل کی طرف چل دیئے۔ اور مختلف صوفیائے کرام کی صحبت میں رہ کر تکمیل روحانیت کرنے لگے۔

۱۲۳۰ء میں ایک منگول نے آپ کو زخمی کیا۔ اس زخم کی تکالیف سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور ۱۱۴ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ، جواہر الذات، وصیت نامہ منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، گل و ہرمز، سیاہ نامہ، شتر نامہ، مختار نامہ، اور ایک غزلوں اور رباعیوں کا دیوان۔ اور ایک کتاب صوفیائے کرام کے حالات میں تذکرۃ الاولیا، انکی یادگار ہیں۔

فارسی میں صوفیانہ شاعری کے اقانیم ثلاثہ۔ حکیم سنائی، مولانا روم اور خواجہ عطار ہیں۔ اگرچہ مثنوی معنوی کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ لیکن مولانا روم نے عطار کے متعلق فرمایا ہے۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ۔۔۔ ما در پس سنائی و عطار آمدیم
ہفت شہر عشق را عطار گشت ۔۔۔ ما ہماں اندر خم یک کوچہ ایم

مضامین تصوف جو عطار نے منطق الطیر وغیرہ میں بیان کئے ہیں۔ وہ زیادہ دقیق نہیں مگر خوب مفصل ہیں۔ زبان نہایت صاف ہے اور مشکل سے مشکل مقامات کو نہایت بے تکلفی اور سادگی سے بیان کیا ہے قوت تخیل سے نئے مضامین بھی پیدا کئے ہیں۔ اور مسلمہ مسائل کو نئے اور دلکش اسلوب سے بیان کیا ہے:۔

وحدت وجود:۔ پُرشد از دست ہر دو کون لیک ۔۔۔ سوئے او زہرۂ اشارت نیست

عبادات:۔ روزہ حفظ دل ست از خطرات ۔۔۔ پس بود با مشاہدہ افطار

حج چہ باشد۔ زخود سفر کردن بہ کجا؟ جانب ہدایت کار
وحی؛۔ وحی چہ بود ہر آنچہ در دل تو سرزند از نتائج اسرار۔

عالم حقیقت کفر و اسلام کی تفریق سے بہت بلند ہے :-

لب دریا ہمہ کفر است در دریا جملہ دینداری ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد

انسان اپنے ہی اندر سب کچھ پا سکتا ہے :-

بہ ہمیں دیدہ بنگری ظاہر صورت خویش را بصورت یار
ہر کہ ایں جا ندیدہ محروم است در قیامت ز لذت دیدار

سعدی شیرازی
۱۱۸۴ — ۱۲۹۱ء

مصلح الدین نام تھا۔ ۱۱۸۴ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمری میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ سعد بن زنگی نے شیخ کو اپنی سرپرستی میں قبول کیا اور تحصیل علوم کے لئے مدرسۂ نظامیہ بغداد میں داخل کر دیا۔ ۱۲۲۶ء میں سند تکمیل حاصل کی۔ اُس کے بعد سیر و سیاحت شروع کی اور عرب، ہند، ایشیا، کوچک اور شمالی افریقہ کے سفر کئے۔ اس سیاحت میں تیس برس کا عرصہ لگا۔ (۱۲۲۶ تا ۱۲۵۶ء) لیکن جو تجربہ اور معلومات حاصل ہوئیں۔ اُن کے سامنے یہ مدت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کئی بار پیادہ پا حج کیا۔ ایک مرتبہ شام میں عیسائیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر خندق کھودنے کے کام پر لگا دئے گئے۔ یہاں سے اُن کے ایک قدیم دوست نے فدیہ دے کر چھڑایا۔ اور اپنے گھر رکھا۔ شیخ کی پہلی شادی اُسی دوست کی صاحبزادی سے ہوئی۔ شیخ کا شمار اُس زمانہ کے معزز صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت تھے۔ آپ کا تخلص سعدی شاہ وقت سعد بن زنگی سے تعلق کا اعتراف ہے۔

سیر و سیاحت سے واپس آ کر شیراز میں مقیم ہوئے۔ اور علمی و ادبی کاموں کی طرف توجہ کی۔ آپ کی زندگی کا یہ باب ۱۲۵۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ آخر عمر میں دنیاوی تعلقات سے کنارہ کش ہو کر شہر سے باہر ایک زاویہ بنا کر رہنے لگے۔ ایک صدی سے زیادہ کی نہایت مفید زندگی بسر کر کے ۱۲۹۱ء میں رحلت کی اور دلکشا میں جا بہ [illegible] کے نام سے مشہور ہے

ایک پہاڑ کے دامن میں دفن ہوئے۔

سعدی صرف ایک بلند پایہ شاعر اور فارسی غزل کے پیغمبر ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک معلم اخلاق، ایک باخدا صوفی، ایک پاکباز شہری، ایک عالم متجر ایک مصلح اعظم، ایک پرخلوص دوست، اور دلچسپ ہمدم بھی تھے۔

بحیثیت شاعر کے انھوں نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور آج متفقہ طور پر غزل کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کی شہرت کی بنیاد اُن کی مشہور عالم تصانیف "گلستان" اور "بوستان" پر ہے ابتدائی زمانہ سے آج تک فارسی زبان میں کوئی ایسی کتاب نظم یا نثر میں نہیں لکھی گئی۔ جو سعدی کی گلستان یا بوستان کی طرح مشہور اور مقبول ہوئی۔ ہو شاید ہی کوئی زندہ زبان ایسی ہو جس میں ان کا ترجمہ نہ ہوا ہے۔

بوستان ۱۲۵۵ء میں مکمل ہوئی اور اس کے ایک ہی سال بعد گلستاں لکھی گئی۔ آپ کی دوسری تصانیف۔ پندنامہ، اور کلیات سعدی ہیں۔ شیخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنی شاعری کو بیکار ضائع نہیں ہونے دیا۔ قصیدہ صرف مدح ہوتی ہے۔ لیکن سعدی نے اس میں بھی ممدوح کو بے باکانہ نصیحتیں کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور تھا کہ شیخ تنگدست رہے۔ احباب یہ حالت دیکھ کر "راہِ راست" پر لانے کی کوشش کرتے لیکن شیخ کا یہ نشہ حرص و آز کی ترشی سے اُترنے والا نہ تھا۔ آزادی کی وہ روح جو شیخ نے فارسی شاعری میں داخل کی اُن کا معجزہ ہے۔

دیکھئے ایک قصیدے میں کس جرأت کے ساتھ اپنا مشرب بیان کیا ہے۔

سعدیا چندانکہ میدانی بگو — حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع دربازنیست — از خطا باکش نباشد وز تتار

اس کے علاوہ جہاں تعریف کی ہے وہاں حقیقت کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھا حتیٰ کہ دعا میں بھی مبالغہ سے گریز کیا ہے۔

ہزار سال نگویم بقائے عمر تو باد — کہ این مبالغہ دانم زعقل نہ شماری

ہمیں سعادتِ توفیق بمزیت باد ۔ کہ حق گزاری وناحق کسے نیازاری

غزل میں سعدی سے پہلے صرف معشوق کی تعریف ہوتی تھی۔ لیکن شیخ دلی جذبات وواردات بیان کرتے ہیں۔ اس لئے اُن کے کلام میں اثر اور بیان میں سوز و گداز ہے۔ شیخ کی غزل دل سے نکلی ہوئی بات ہے۔ دل پر اثر کرتی ہے۔

خبرا برسانید بہ مرغانِ چمن ۔ کہ ہم آواز شما درقفسے افتادہ است

ہمہ از دست غیر نالہ کنند ۔ سعدی از دست خویشتن فریاد

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر ۔ بہ سر نہ کوفتہ باشد در سرائے را

اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوزم ۔ تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

آپ نے اپنی غزل میں ریاکار زاہدوں، مکاروں، صوفیوں اور واعظوں کی اصلی حالت کو زمانہ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور اس طرح کے چبھتے ہوئے فقرے لکھے ہیں کہ دل میں اُتر جاتے ہیں۔

محتسب در قفائے رندان است ۔ غافل از صوفیان شاہد باز
ہر دو نمی رود از خانقہ یکے ہشیار ۔ کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

شیخ سے بڑا معلم اخلاق ایران میں پیدا نہیں ہوا۔ گلستاں اور بوستاں میں آپ نے حکایات کے پیرایہ میں زندگی کے ہر پہلو پر خواہ وہ جہانبانی سے متعلق ہو یا گداگری سے روشنی ڈالی ہے۔ اور کامیاب زندگی کے لئے نصیحتیں کی ہیں۔ بادشاہ سے کہتے ہیں:۔

ظلم کا نتیجہ:۔ چو بیداد کردی توقع مدار ۔ کہ نامت بہ نیکی رود در دیار
ترا چارہ از ظلم برگشتن است ۔ نہ بے چارۂ بے گنہ کشتن است

قناعت: قناعت کن اے نفس بر اندکے | کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش سلطان بخواہش روی | چو یکسو نہادی طمع، خسروی

خاموشی: ترا خامشی اے خداوند ہوش | وقار است و نااہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبت خود مبر | وگر جاہلی پردۂ خود مدر

"گلستان" میں بھی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ مختلف حکایات ہیں۔ جن سے شیخ نے بیش بہا نتائج اخذ کئے ہیں۔ صاحب مجمع الفصحا نے صحیح لکھا ہے کہ فارسی میں اس سے بہتر نثر کی کتاب موجود نہیں۔ عبارت سہل ممتنع ہے۔ اور متن علم و حکمت کا خزانہ۔

---

(۶)

دورِ منگولیہ

کمال اسمٰعیل اسمٰعیل نام اور کمال تخلص تھا۔ انکے والد جمال الدین عبدالرزاق بھی اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے، شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت تھے، آخری عمر میں دنیا سے کنارہ کش ہو کر شہر کے باہر رہنے لگے تھے

یہ مشہور ہے کہ جب اغوتائی خاں نے اصفہان پر حملہ کیا تو شہر کے لوگوں نے اپنے تمام زیورات، جواہرات، اور قیمتی کپڑے کمال اسمٰعیل کے پاس بطورِ امانت کے جمع کر دئے تھے۔ اور انھوں نے سب امانتیں ایک قریبی کنوئیں میں رکھدی تھیں۔ شہر کی فتح کے بعد منگولوں نے شہر کے کونے کونے کو دولت کی تلاش میں چھانا۔ اسی ہنگامہ میں اتفاقاً ایک منگول سپاہی کمال اسمٰعیل کے گھر کی طرف سے گزرا۔ اور مال و دولت سے بھرے ہوئے کنوئیں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید

اُن کے قبضہ میں اور دولت بھی ہو۔ اُس نے پوچھا لیکن جب اُنھوں نے کچھ نہ بتایا تو قتل کردیا۔ یہ واقعہ ۶۲۹ھ یا ۶۳۵ھ کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کمال اسمٰعیل نے مندرجہ ذیل رباعی آخری وقت میں کہی تھی اور اپنے خون سے دیوار پر لکھ دی تھی۔

ایں کشتۂ تیغ کمال اسمٰعیل است   قربان شدنش نہ از رہِ تبجیل است
قربان تو شد کمال اندر رہِ عشق   قربان شدن از کمال اسمٰعیل است

کمال اسمٰعیل صف اوّل کا شاعر تھا اور بڑی خوبی یہ تھی کہ اساتذہ سلف و مابعد کے تمام محاسن اس میں جمع تھے۔ انوری اور خاقانی کی شان و شوکت، ظہیر فاریابی کی سلاست اور شیرینی، عرفی اور نظیری کی خیال بندی، جدت ادا، اور نادر تشبیہات کا استعمال بیک وقت اسمٰعیل کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ معاصرین اور متاخرین نے اسمٰعیل کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔

خواجہ حافظ:- گر باورت نمی شود از بندہ ایں حدیث   از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم
گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر   آں مہر بر کہ افگنم و دل کجا برم

عرفی مرا ز نسبتِ ہمدردی کمال غم است   دگر نہ شعر چہ غم دارد از غلط خوانی

حزیں:- جمال پر ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے۔

در شعر جمال ار چہ جمالے بکمال است   اما نہ بہ زیبائی افکار کمال است
لفظش بہ صفا آئینۂ شاہد معنی است   یعنی بہ نکوہے ست کہ طغرائی ہلال است
صد بار ز سر تا سر دیوانش گزشتم   لیلی ست کہ سر تا قدم غنج و دلال است

محقق طوسی نے بھی معیار الاشعار میں تعریف کی ہے۔

جدت مضامین:- چوں صبح باز کرد دہن را بوصف او   چرخش درست مغربی اندر دہاں نہاد
افگند چار نعل ہلال آسماں دو بار   تا بارکاب خواجہ عناں در عناں نہاد

مشکل قوافی اور سنگلاخ زمینوں میں اعلیٰ مضمون پیدا کیے ہیں:-

دگر و عزم او نہ رسد برق گرم رو   در زآتش بود بہ مثل چوں شرار پائے

از یمن ہمت تو بر آرم چو مور پر — از فرط عجز اگرچہ ندارم چو مار پائے
ہرگز کسے ندید بدنیاں نشاں برف — گوئی کہ لعمہ ایست زمیں در دہاں برف

سلاست اور روانی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا بہہ رہا ہے۔

سپیدہ دم کہ نسیم بہار می آید — نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آید
شراب در سر و چہرہ ز شرم رنگ آمیز — چنیں میانہ شرم و عقار می آید
رخش چو شاخ درخت بہشت در ہر گل اوں — کہ می بچیدم و دیگر بہار می آید

اسی کے ساتھ رنگینی اور جدتِ مضامین بھی قابل داد ہے۔

بود ہمیشہ جان من رسم تو تبلے گنہ کشتی — بہیچ می کشتی مرا، من بہ گناہ کردہ ام
پراگندہ ہمہ غمہائے عالم — زبہر من بہ یک دیگر کشیدی

رباعیاں بھی کہی ہیں اور بہت عمدہ ہیں۔

گل خواست کہ چوں رخش نکو باشد و نیست — چوں دلبر من برنگ و بو باشد و نیست
صد روئے فراہم آورد در سالے — باشد کہ یکے چو روئے او باشد و نیست

عراقی فخر الدین ابراہیم نام، عراقی تخلص، ہمدان کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں قرآن شریف حفظ کیا۔ عنوانِ شباب میں صوفیائے کرام کے ایک گروہ سے ملاقات ہوئی۔ فطرت سے درد منددل لے کر آئے تھے۔ اُن سے اس قدر دلچسپی بڑھی کہ ہندوستان چلے آئے۔ یہاں آکر شیخ بہاء الدین زکریا سے بیعت کی اور ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ مگر دل نہ لگتا تھا۔ اور لوگ ذکر و شغل کرتے یہ شعر پڑھا کرتے۔ مریدوں نے شیخ سے شکایت کی۔ انھوں نے بلا کر شعر سُنے۔ آپ نے پوری غزل سنائی چند اشعار یہ ہیں

نخستیں بادہ کاندر جام کردند — ز چشم مست ساقی وام کردند
سر زلف بتاں آرام نگرفت — زبس دلہا کہ بے آرام کردند
بہ مجلس نیک و بد را جائے دادند — بجامی کارِ خاص و عام کردند
بعالم ہر کجا درد و غمے بود — بہم کردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش — عراقی را چرا بدنام کردند

شیخ نے یہ اشعار سن کر سینے سے لگا لیا اور خرقہ و اجازت عطا فرمائی

۲۵ سال تک ہندوستان ہی میں مقیم رہے۔ شیخ کے بعد صاحب سجادہ ہو گئے مگر مخالفین نے چین نہ لینے دیا۔ بالآخر حج کو گئے۔ اور وہاں سے قونیہ میں آکر شیخ صدر الدین رومی کے شاگرد ہوئے اور لمعات کے نام سے تصوف پر ایک مبسوط اور بلند پایہ کتاب لکھی۔ عبارت نہایت دلچسپ اور شیریں ہے پھر جابجا فارسی اور عربی کے اشعار لکھے ہیں۔ جن سے حسن بیان دوبالا ہو گیا ہے آخر عمر میں شام کا سفر کیا اور وہیں انتقال کیا۔ صالحیہ دمشق میں دفن ہوئے کلام میں ایک عجیب کشش اور دلآویزی ہے۔ اور یہ اثر ہے اُن کی کیفیات دلی کا۔ صوفی تھے۔ دل عشق حقیقی سے معمور اور لذات عشق سے آشنا تھا۔ جو کچھ کہا وہ صحیح واردات قلب اور تاثرات تھے۔ جگر کے ٹکڑے تھے جو الفاظ کے جامے میں پیش کئے۔ ظاہر ہے کہ اثر، سوز، اور دلکشی کیسی کچھ ہو گی۔ اُن کے کلام کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا مخمورانہ انداز میں کیفیات دلی کو والہانہ طریقہ پر بیان کر رہا ہے۔

از پردہ برون آمد ساقی قدحے بدست ہم پردۂ ما بدرید ہم توبہ ما شکست
بنمود رُخ زیبا گشتیم ہمہ شیدا چون ہیچ نماند از ما آمد بر ما بنشست

زلفش گرہے بکشاد بند از دل ما برخاست جاں دل زجہاں برداشت واندر سر زلفش بست
در دام سر زلفش ماندیم ہمہ حیراں وز جام مئے لعلش گشتیم ہمہ سرمست
چوں سلسلہ زلفش بند دلِ حیراں شد آزاد شد از عالم وز ہستی خود وارست

عراقی طالب درد است و آں نیز بامیدے کہ درمانش تو باشی

غزلیات سے صاف ظاہر ہے کہ حافظ کا کمال شعر اسی بارگاہ کا فیض ہے اثر، جوش، سلاست سب عراقی کا ورثہ ہے جو حافظ نے پایا۔

ایک مثنوی عشاق نامہ بھی لکھی تھی۔ مگر اب نایاب ہے۔

مولانا روم
۱۲۰۷ — ۱۲۷۲

جلال الدین محمدؒ نام ہے۔ لیکن عام طور پر مولانا روم کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۲۰۷ء میں بلخ میں پیدا ہوئے آپ کے والد شیخ بہاء الدین اپنے زمانہ کے نہایت بزرگ صوفی تھے۔ اور بے شمار لوگ آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ۱۲۳۱ء میں جب کہ مولانا کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ آپ کے والد نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد شام کو تحصیل علوم کے لئے گئے۔ ۷ برس تک دمشق میں رہ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ اسی زمانہ میں آپ کی ملاقات حضرت شمس تبریزیؒ سے ہوئی مولانا مرید ہوئے اور ایک ہی سال میں اس مرد مومن کی نگاہ سے مولانا کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوا۔ جس نے ایک عالم اور واعظ کو صوفی اور رقاص ہی بنا دیا۔ حضرت شمس تبریزؒ سے اس قدر عشق تھا کہ آپ کی عارضی غیر حاضری میں مولانا کی حالت غیر تھی دنیا کی ہر چیز کو ترک کر دیا تھا۔ خاموش رہتے تھے۔ جب حضرت شمسؒ پھر آئے تو مولانا کو چین آیا۔ لیکن وصال کی یہ لذت عارضی تھی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد حضرت شمسؒ کا انتقال ہو گیا اور مولانا کی زندگی نا آشنائے صبر و سکون ہو گئی۔ ہر وقت ایک بے خودی اور وارفتگی طاری رہتی اور اشعار پڑھتے رہتے تھے۔ سکونِ قلب کے لئے شیخ صلاح الدین زرکوبؒ کی رفاقت اختیار کی۔ اور ان کی شان میں غزلیں کہیں۔

مطربا اسرارِ مارا باز گو	قصہائے جانفزا را باز گو
ما دہاں را بستہ ایم از ذکر او	تو حدیث دلکشا را باز گو
چوں صلاح الدین صلاح جانِ ماست	آں صلاحِ جانہا را باز گو

مولانا نے ۱۲۷۳ء میں وصال فرمایا۔

مولانا کی شہرہ آفاق 'مثنوی' کے سات دفتر ہیں۔ یہ آپ کے مرید خاص حسن حسام الدین چلپی کی فرمائش پر دس سال (۱۲۷۳ء) میں مکمل ہوئے۔ مثنوی کے متعلق آج تک اس سے زیادہ صحیح اور جامع رائے نہیں

دی گئی جو ان اشعار میں درج ہے:-

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی
من نمی گویم کہ آں عالیجناب ہست پیغمبر ولے دارد کتاب

صاحب آتشکدہ نے لکھا ہے کہ "عین الیقین کو بواسطۂ علم الیقین مرتبۂ عیانی تک پہنچا دیا ہے۔" صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ "دنیائے شعر میں شاہ نامہ اور مثنوی ایسی بے نظیر کتابیں ہیں۔ جن کا جواب ناممکن ہے۔"

مثنوی کی زبان آسان پہلوی ہے۔ اس لئے متروکات اور غیر مانوس الفاظ بھی ملیں گے۔ اس کے علاوہ مولانا نے مثنوی میں عروس سخن کی زلف آرائی کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ اس لئے فک اضافت اور تعقید لفظی بھی ملتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بات سے مثنوی کے رتبہ میں سرمو فرق نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس کا مرتبہ ان ظاہری محاسن سے بہت بلند ہے۔

مثنوی میں حکایات و قصص کے ذریعہ سے معاملات تصوف اور مسائل زندگی اس خوش اسلوبی سے بیان کئے ہیں۔ کہ نہایت دقیق و نازک مسائل تک تمثیلی حکایات کے ذریعہ سے واضح ہو گئے ہیں۔ مولانا کی قوت تخئیل کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ تصوف کے عام ذہنیت سے بالاتر مسائل کے لئے انھوں نے روزمرہ کی زندگی سے نہایت موزوں حکایات جمع کر لی ہیں۔ مثنوی کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ فلسفہ، علم اشیاء، اور مسائل جغرافیہ تک کو بیان کیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ اس درجہ مقبول ہے۔

مولانا کا درس خودی کی بیداری ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ انسان جس کو خدا نے خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے، اپنی قوتوں کو پہچانے اُن کا احساس کرے اور اُن کو جلا دے کر خدمت خلق میں صرف کرے۔ موجودہ دور میں مولانا کے اس نظریہ عمل کا علمبردار اقبال گزرا ہے۔

مثنوی ہر تنقید سے بالاتر ایک صحیفہ الٰہی ہے۔ جو حق شناسی کے لئے شمع ہدایت کا کام کرتی ہے۔

آپ کی غزلیات کا مجموعہ حضرت شمس تبریزی کے نام سے شائع شدہ موجود ہے۔ یہاں بھی وہ وارفتگی عشق، اور جوش موجود ہے جو اہلِ دل کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

یار کہ آمد ز در، خلوتیاں دوست دوست
دیدہ غلط می کند نیست غلط اوست اوست

مولانا جن مقامات عشقِ الٰہی سے گزرتے جاتے، اور اس مقام پر جو احساسات ہوتے ان کو نظم کر دیتے تھے۔ شعر، شعر کی خاطر کبھی نہیں کہا۔ اسی لئے اس کی ظاہری خوبیوں کی طرف توجہ نہیں کی۔

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ آفتاب گویم

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

نثر میں ایک تصنیف فیہ ما فیہ ہے جس میں معین الدین پروانہ کے نام خطوط ہیں۔

نصیر الدین طوسی
۱۲۷۴ — ۱۲۰۰ء

نصیر الدین نام تھا۔ ۱۲۰۰ء میں بمقام طوس پیدا ہوئے بہت بڑے عالم تھے۔ فلسفہ، ادب، ہیئت، نجوم رمل۔ طبیعات، ریاضی، اور دیگر علوم پر دستگاہ کامل حاصل تھی۔ عرصہ تک اسمعیلیوں کی قید میں رہے۔ ہلاکو خاں نے ۱۲۵۶ھ میں جب اس فرقہ کی بیخ کنی ہے تو انھیں رہائی نصیب ہوئی۔ ہلاکو خاں ان کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اور بڑی قدر و منزلت کی۔ بغداد کی تباہی کے وقت یہ اپنے آقا کے ساتھ وہیں موجود تھے۔ جب وحشی منگولوں نے بغداد کے

قیمتی کتب خانے برباد کرنے شروع کیے۔ تو طوسی نے بہت سی نادر کتابیں اپنے لئے محفوظ کر لیں۔ مراغہ کی شاہی رصدگاہ انھیں کی نگرانی میں تیار ہوئی۔ بسنہ ۶۷۲ھ میں بمقام بغداد انتقال کیا۔ تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ کوئی مضمون اخلاق، کیمیا، نجوم، ہیئت ایسا نہیں ہے۔ جس پر کامیابی سے قلم نہ اٹھایا ہو۔ لیکن ان میں اکثر عربی میں ہیں۔ فارسی تصانیف میں اخلاقِ ناصری سب سے بہتر ہے۔ اس میں سیاست مدن، اور تدبیر منزل کے عنوانات پر نہایت تفصیلی بحث ہے اور علم الاخلاق پر بھی ہر نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ ارسطو اور دوسرے حکمائے یونان کے نظریئے بیان کر کے ان پر جو اعتراضات کئے گئے تھے اُن کے جواب دئے ہیں۔

کتاب کی زبان نہایت مشکل ہے۔ عبارت عالمانہ اور گنجلک ہے۔ تراکیب اور محاورات کثرت سے عربی ہیں۔ بعض جگہ تو عربی تلمیحات اور کبھی کبھی عربی فقرات کا لفظی ترجمہ بھی ہے۔

طوسی شاعر بھی تھے۔ لیکن شعر میں بھی وہی فلسفیانہ اور عالمانہ رنگ موجود ہے۔ جس کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔

موجود بحق واحد اوّل باشد　　باقی ہمہ موہوم و مخیّل باشد
ہر چیز جز او کہ آید اندر نظرت　　نقش دومین چشم احول باشد

وصّاف عبداللہ بن فضل اللہ نام اور وصاف تخلص تھا۔ شیراز کا رہنے والا تھا۔ غازان خاں کے حکم سے شاہان منگول کی ایک مفصل تاریخ مرتب کی جو سنہ ۷۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔ کتاب کی تاریخی حیثیت کے متعلق یہ ثابت ہو چکا ہے کہ واقعات نہایت معتبر ہیں۔ لیکن کتاب کی زبان نہایت مشکل ہے۔ عربی اور ترکی کے الفاظ نہایت کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ پھر مرادف فقروں اور دور از قیاس تشبیہات اور استعارات نے رہی سہی

سلاست کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اس کے چند فقرے نمونہ کے طور پر درج کئے جاتے ہیں
"رحسن را بہ ہمیں گناہ مواخذت فرمود۔ بے جان او را بنجشید۔ آیت طفلی در الاطاق ہنگام عربدۂ گیخا تو خاں بحکم فرماں بے ادبی نمودہ بود یار غو حاضر گشت جوابے درست، درشت، بے دہشت" دکان منہ العقول بالجد دہشت" عرضہ داشت کہ آنروز گیخا تو خاں بر تخت خانیت متمکن بود الخ"

---

(۷)

ابتدائی دورِ تیموریہ

ابنِ یمین ۱۳۶۸ء

امیر محمود نام تھا۔ آپ کے والد امیر یمین الدین طغرائی اپنے زمانہ کے نامور شاعر تھے۔ تخلص ابن یمین اسی تعلق سے رکھا تھا۔ ان کے والد ترک تھے۔ اور سلطان محمد خدا بندہ کے زمانہ میں بمقام فریومد آکر مقیم ہوئے۔ یہاں جائداد خریدی اور گھر بنا لیا علاء الدین محمد عہدۂ وزارت پر سرفراز تھے۔ انھوں نے امیر یمین الدین کی بڑی قدر کی۔

ابن یمین فریومد میں پیدا ہوئے۔ غالباً فن شاعری میں اپنے والد ہی کے شاگرد تھے۔ شاہان سربدار کی مدح سرائی کرتے تھے۔ آخر عمر میں ترک دنیا کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جو آبائی جائداد باقی تھی۔ اسی پر زندگی بسر کی۔ ۱۳۶۸ء میں وفات پائی۔ ذیل کی رباعی آخر زندگی میں کہی تھی۔

منگر کہ دل ابن یمین پر خون شد بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
مصحف بکف و چشم بر رہ روئے بدوست با پیک اجل غمزہ زناں بیروں شد

ان کا دیوان خاندان سربدار اور ترکمانوں کی لڑائی میں ۱۳۴۶ء میں ضائع ہو گیا۔ صاحب ید بیضا نے ان کی غزل کے چند شعر نقل کئے ہیں۔

سر بدہ اے دیدہ در دم اشک غماز مرا تا نسازد فاش پیش مرداں راز مرا

زخود بیگانہ بودن در رہ عشق — بہ آں معشوق طرح آشنائی است

ان اشعار سے انکی شاعری کے متعلق کوئی رائے اس کے علاوہ نہیں قائم کی جاسکتی کہ وہ کم رتبہ غزل گو نہ تھے۔ صاحب شعر العجم کے بقول "ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت، اور خودداری ان کا خاص حصہ ہے۔ ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کوئی ادا نہ کرسکا" پھر انکے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ جو دل پہ گزرتی ہے وہ شعر میں بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں جو تاثیر ان کے کلام میں ہوگی۔ وہ خالی نصیحت گری میں کس طرح ہو سکتی ہے۔

دو قرص نان، اگر گندم است یا از جو — دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود بہ خاطر جمع — کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین — ز فر مملکت کے قباد و کے خسرو

شاعری نیست پیشۂ کہ ازاں — رسدت نان و نیز تربہ و دوغ
راستی سخت زشت و بے معنی است — اجرتے خواستن برائے دروغ
زاں بود کار شاعراں بے نور — کہ ندارد چراغ کذب فروغ

خواجو کرمانی (۱۳۵۲ء) کمال الدین ابو العطا محمود بن علی بن محمود نام تھا۔ لیکن عام طور پر اپنے تخلص خواجو سے پہچانے جاتے ہیں۔ ۱۲۸۱ء میں بمقام کرمان پیدا ہوئے۔

تکمیل تعلیم کے بعد سیاحت کا شوق ہوا اور مختلف مقامات کی سیر کی اسی سفر میں شیخ علاء الدین سمنان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور مختلف درباروں میں سلاطین اور امراء کی مدح سرائی کی۔ سب سے پہلے مبارز الدین محمد[3] بانی خاندان مظفریہ کے دربار میں باریابی حاصل کرکے انعام و اکرام حاصل کئے۔ اس کے بعد شیروان شاہ اور قزل ارسلان کے درباروں میں حاضر ہوئے۔ خواجو معاصر شعراء اور مصنفین میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اور ان سے ملاقات تھی۔ ۱۳۵۲ء میں انتقال کیا۔

خواجو کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دیوان جو غزلیات، قطعات قصاید اور رباعیات پر مشتمل ہے اور پانچ مثنویاں۔ (۱) نوروز و گل (۲) ہما و ہمایوں (۳) کمال نامہ (۱۳۴۴ء) (۴) روضتہ الانوار (۱۳۴۳ء) (۵) ایک اور مثنوی جس کا نام معلوم نہیں۔

خواجو کے معاصرین میں ابن یمین اور سلمان ساوجی نے غزل کی ترقی میں خاص حصہ لیا۔ غزل کی ابتدا سعدی سے ہوئی۔ خسرو اور حسن دہلوی نے اس کو جلا دی اور خواجو اور اُس کے معاصرین نے مضمون آفرینی اور تخیل کاری کا اضافہ کیا۔

خواجو کی غزلیات میں ترنم، سلاست، اور روانی کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی بھی ہے۔ ذیل کے متنزاد سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

کس نیست کہ گوید ز من آں ترک خطا را   گر رفت خطا ئے
باز آئے کہ داریم توقع بتو ما را   با وعدہ وفائے
کافتادم از آں دانۂ مشکین تو یارا   در دام بلائے
امروز منم چوں خم ابروئے تو در شہر   مانند ہلالے
تا دیدہ ام آں صورت انگشت نما را   انگشت نمائے
در شہر شما قاعدہ باشد کہ نہ پرسد   احوال غریباں

عبید زاکانی ۱۳۷۱ء

نظام الدین عبید اللہ نام اور عبید تخلص تھا۔ زاکان کا رہنے والا تھا۔ شیراز میں تعلیم حاصل کی۔ اس زمانہ میں ایران کی اخلاقی حالت تاتاریوں کے غلبہ نے بہت خراب کر دی تھی۔ عبید زاکانی نے اخلاق الاشراف میں اس زمانے کی اخلاقی پستی کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح ایران کے یہ مہذب انسان اخلاقی حیثیت سے درندوں سے بدتر تھے۔ اسی طرح رسالہ دلکشا میں علمی پستی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رسالہ صد پند اور رسالہ تعریفات میں اخلاقی تعلیم دی ہے۔ عبید زاکانی کی شاعرانہ زندگی عجیب اتفاقات کا نتیجہ ہے

تنگ دستی نے اس کو درباری توسل حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک رسالہ معانی و بیان کا تصنیف کر کے شاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دربار کے حاسد اور خود غرض شعراء نے رسائی نہ ہونے دی۔ اس کے بعد اس نے ایک قصیدہ لکھا اس پر بھی وہ دربار تک نہ پہنچ سکا، تنگدستی اور اس پر یہ بدقسمتی ایسا حادثہ تھا کہ اس کا دل و دماغ برداشت نہ کر سکا۔ مجبور ہو کر اس نے اپنے ذہنی قویٰ کا غلط استعمال کیا۔ اور ہجو گوئی شروع کر دی۔ (صنادید عجم) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ہجو یہ نظمیں جو یقینی طور پر نہایت فحش ہیں۔ نزاکت خیال، بلندی مضامین، صحت و سلاست زبان کا مرقع ہیں۔ ہجو گوئی اختیار کرتے ہی عبید کی تنگ دستی رفع ہو گئی۔ اسی کا تذکرہ اس نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم	کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز	تا داد خود از مہتر و کہتر بستانی

اس کے قصائد و قطعات سے جو ہجو اور فحش سے پاک ہیں اس کی لیاقت اور قوت شعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

افتادہ بازم در سرہوائے	دل بازدارد میلے بجائے
او شہریارے من خاکسارے	او بادشاہے من بینوائے
بالا بلندے گیسو کمندے	سلطاں جبینے فرماں روائے
ابرو کمانے نازک میانے	ناہر بانے تشنگے دغائے
دارد شکایت ہر کس ز دشمن	مارا شکایت از آشنائے

دیکھئے کیسی دلکش زبان ہے۔ اور کس قدر روانی و برجستگی ہے۔ عبید کی تصانیف میں عشاق نامہ، اور موش و گربہ بھی قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں بھی عبید نے زور تخیل سے جان ڈال دی ہے۔ بلی کی تعریف کرتا ہے۔

از قضائے فلک یکے گربہ	بود چوں اژدہا بکرمانا
گربۂ دوربین و شیر و شکار	کہربا چشم و تیز مژگانا
پائے کژ دم عقاب پیشانی	بود پر کرد زور و دستانا
شکمش طبل و سینہ اش تا قم	ابروش قوس و تیز دندانا

دیکھئے بلی کا حلیہ اس کی صفات کو پیش نظر رکھ کر کس قدر مکمل تراشا ہے

سلمان ساؤجی
۱۳۰۰ — ۱۳۷۶ء

جمال الدین محمدؔ نام اور سلمان تخلص تھا۔ اس کے والد علاؤالدین محمدؔ جو سادہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہان جلائرؔ کے دربار میں ملازم تھے سلمان ۱۳۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۷۶ سال کی عمر میں ۱۳۷۶ء میں انتقال کیا۔

سلمان نے سب سے پہلے خاندان جلائرؔ کے بانی شیخ حسن بزرگ کے دربار میں جگہ پائی۔ اس کے بعد شیخ اویس اور اُس کی حرم دلکشا خاتون کی قدردانی نے اُسے غم دنیا سے آزاد رکھا۔ اور ہمیشہ اتنا دیا کہ سلمان کو کبھی شکایت نہ ہوئی آخر عمر میں جب دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی کرنی چاہی تو سلطان کو چار قطعات لکھے جن میں اپنی یہ خواہش ظاہر کی اور ادائیگی قرضہ اور معاش کے لئے روپیہ طلب کیا۔ سلطان نے بخوشی قرضہ ادا کیا اور ایک جاگیر عطا کی۔

سلمان کے کمال شاعری کو اس کے معاصرین مثلاً حافظ وغیرہ نے تسلیم کیا ہے۔ حقیقت میں وہ قصیدہ کے میدان کا مرد ہے۔ اور یہاں قدماء معاصرین اور متاخرین سب میں اپنی ایک نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ طرز ادا کی دلکشی اور بلند آہنگی، زبان کی سلاست، تخیل کی بلند پروازی اس کے قصائد کی خصوصیات ہیں۔ پھر اس کے کلام میں قدماء، اور متاخرین کی خصوصیات اس خوبی سے جمع ہیں کہ اس کی دوسری مثال مشکل سے ملتی ہے۔ علاوہ قصائد کے اُنھوں نے ایک مثنوی جمشید و خورشید بھی لکھی ہے۔ ذیل میں اُن کے قصائد کے محاسن اور خوبیاں درج کی جاتی ہیں :-

زبان کی سلاست اور صفائی، تراکیب کی پختگی، اور الفاظ کی صحت اُن کے

کلام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے:۔

خندۂ زد دہنت انگشت شکر پیدا کرد — سخنے گفت لبت لولوی تر پیدا کرد
بود نایافت میان تو ولیکن کمرت — چست بر بست میاں را و بہ زر پیدا کرد

نزاکت مضمون، جدت تشبیہہ و استعارات، صنائع و بدائع کا موزوں
استعمال کلام کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے:۔

بعد ازیں از گرہ زلف مغاں کن تسبیح — پس ازیں از خم ابروئے بتاں کن محراب
خوش برآ ہمچو حباب از مے گلگوں و منہ — ہیچ بنیاد بریں گنبد گردوں چو حباب

اس عصر کے اساتذہ مشکل ردیفوں میں نمایش کمال کے لئے طبع آزمائی
کرتے ہیں۔ سلمان نے بھی اس میدان میں دادِ سخن دی ہے۔ دیکھئے مشکل
اور سنگلاخ زمینوں میں کیسے رواں شعر کہتے ہیں۔

منم امروز بلائے شب ہجران بر سر — کردہ در کار تو چوں شمع دل و جان بر سر
دست آنم نہ کہ در دامنت آویزم و بس — تا مگر گستردم لطف تو داماں بر سر

سلمان نے صنعت ایہام کا استعمال نہایت کثرت سے کیا ہے اور اکثر
مقامات پر اس نے شعر کے حسن معنوی اور صوری میں اضافہ ہی کیا ہے۔

چشم سرمست ترا عین بلا می بینم — لیکن ابروئے تو چیزے نیست کہ بالائے اوست
سرو را باد صبا منصب بالا بخشید — لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

نیست سودائے سر زلف تو کار ہمہ کس — کاں طریقے است خم اندر خم دلگیر و دراز

سلمان کی غزلیات کا مرتبہ گو آج بھی سعدی اور حافظ کے برابر نہیں
ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی طبیعت غزل گوئی کے لئے موزوں ہی نہ تھی
پھر بھی زورِ کلام قابلِ تحسین ہے۔

یک شب خیال چشم تو دیدیم ما بخواب — زاں شب دگر بہ چشم ندیدیم خواب را

من خراباتیم و بادہ پرست ——— در خرابات مغاں عاشق و مست /
می کشندم چو سبو دوش بدوش ——— می برندم چو قدح دست بدست

حافظ شیرازی

شمس الدین محمد حافظ کے والد بہاء الدین اصفہان سے شیراز آئے اور تجارت سے بہت دولت کمائی۔

اُن کے انتقال کے بعد مال و دولت تقسیم ہو گیا۔ اور ساری دولت اُن کے بڑے لڑکوں نے تباہ کر دی۔ اور حافظ تقریباً محتاج ہو گئے۔ ان کی ماں نے فاقہ کشی سے بچنے کے لئے اُنھیں پڑوس میں ایک متمول شخص کی، خدمت گزاری پر نوکر کرا دیا۔ سمجھ آجانے پر حافظ نے یہ نوکری چھوڑی اور خمیر تیار کرنا شروع کیا۔ اس آمدنی میں سے ایک تہائی وہ اپنی والدہ کو دیتے تھے۔ ایک تہائی اپنے اُستاد کو جن سے وہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور بقیہ خیرات کر دیتے تھے۔ ایک مدرسہ میں حافظ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور قرآن شریف حفظ کیا۔

نان بائی کی دُکان پر ایک مختصر سی "مجلسِ سخن" منعقد ہوتی تھی۔ اور قرب و جوار کے شعراء غزل خوانی کرتے تھے۔ حافظ کو یہ دیکھ کر شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ شعر کہنا شروع کیا۔ لیکن اُن کی غزلیں نہایت بے تکی ہوتی تھیں۔ کبھی مصرعے کے مصرعے ناموزوں اور کبھی بحر سے خارج۔ غرض شعراء کے لئے ایک سامان تفریح تھا۔ ہر شخص ان سے غزلیں سنتا اور مذاق اُڑاتا تھا۔ حافظ ایک عرصہ تک تو یہ معاملہ سمجھ نہ سکے لیکن جب محض تفریح حاصل کرنے کے لئے انھیں لوگ دور دور بلانے لگے تو اُنھیں بہت رنج ہوا۔ اور ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہتے کہ کس طرح اس کمی کو پورا کروں۔

حضرت بابا کوہی کا مزار اس عہد میں مرجع خاص و عام تھا۔ لوگ مرادیں حاصل کرنے کے لئے اس مزار پہ چلے کیا کرتے تھے۔ حافظ نے بھی چلہ کشی

کا ارادہ کیا۔ سرِشام ہی وہ مزار پر پہنچ جاتے تھے اور رات بھر مشغولِ عبادت رہ کر صبح کو واپس آ جاتے۔ اسی زمانہ میں حافظ کو ایک خاتون "شاخِ نبات" سے محبت ہو گئی تھی۔ چالیسویں رات کو وہ حضرت باباکوہی کے مزار کو جا رہے تھے کہ شاخِ نبات کے گھر کے سامنے سے گزر ہوا۔ اس نے بلایا۔ حافظ محبوب کی دعوت کی خوشی میں سب کچھ بھول گئے۔ اور اس کے گھر رات بسر کرنے کی ٹھان لی۔ اخیر رات میں یاد آیا کہ چلّہ کی اخیر رات ہے۔ اگر آج غفلت کر گئے تو چالیس دن کی محنت برباد جاتی ہے۔ فوراً گھبرا کر اٹھے اور مزار شریف پر پہنچے۔ نور کے تڑکے میں ایک سبز پوش بزرگ صورت نمودار ہوئے۔ جس نے حافظ کو کچھ کھانے کو دیا۔ یہ بزرگ کون تھے؟ اس پر بحث فضول ہے۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس کے کھاتے ہی حافظ ایک ایسے شیریں گفتار اور شعلہ زن شاعر ہو گئے کہ ایران کیا دنیائے مشرق آج تک اس کا جواب نہ پیش کر سکی۔

حافظ کی زندگی میں ایران میں کئی خاندان حکمراں رہے۔ اس لئے انھیں شاہ ابو اسحٰق انجو، شاہ فارس و شیراز، محمد مظفر شاہ شجاع اور زین العابدین کی قدردانی سے لطف اندوز ہونے کا فخر حاصل رہا۔

حافظ اور تیمور کی ملاقات جس کے متعلق مشہور ہے کہ ان سے تیمور نے پوچھا کہ تم میرے عزیز وطن سمرقند اور بخارا کو اپنے محبوب کے تل پر قربان کرنے کو تیار ہو۔ حالانکہ میں نے ان کو کس قدر مشقت اٹھا کر فتح کیا ہے۔"

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را   بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اور حافظ نے جواب دیا کہ ایسی ہی سخاوتوں کی بدولت تو آج میں اس حال میں ہوں۔ یہ ملاقات تیمور کے پہلے حملہ شیراز ۱۳۸۶ء کے وقت ہوئی ہوگی نہ کہ دوسرے حملہ کے وقت جو ۱۳۹۳ء میں ہوا۔ اس لئے کہ حافظ کا انتقال ۱۳۸۹ء میں ہو چکا تھا۔

حافظ کو اس کی زندگی ہی میں عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ صرف شاہانِ مظفریہ ہی ان کی دلداری نہ کرتے تھے۔ بلکہ ایران سے باہر کے سلاطین سلطان احمد شاہ بغداد، سلطان محمود شاہ بہمنی (دکن) سلطان غیاث الدین (نواب بنگالہ) نے بھی بارہا ان کو بلایا اور دربار میں رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ حافظ کا انتقال ۱۳۸۹ء میں ہوا۔ اور خاکِ مصلیٰ میں دفن ہوئے۔ سلطان بابر کے وزیر نے قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرا دیا ہے۔ اور اب یہ مقام حافظیہ کہلاتا ہے۔

حافظ کو عربی اور فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ نظم میں بھی انھوں نے ہر صنفِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ اگرچہ اُن کے قصائد، قطعات اور رباعیات فارسی ادب میں بہت بڑا مرتبہ نہیں رکھتے۔ مگر یہ خیال کہ حافظ غزل کے سوا کچھ نہ کہہ سکتے بالکل غلط اور لغو ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی غزلیات نے فارسی شاعری کی دنیا ہی بدل دی اور اُن کے بعد کے آنے والے شعراء نے بلا استثنا ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اور اس سے بھی انکار ناممکن ہے کہ حافظ کا دیوان غزل میں حرفِ آخر ہے۔

جب حافظ نے غزل سرائی شروع کی تو ایران کی فضا سلمان اور خواجو کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بھی خواجو کا تتبع شروع کیا۔

۱۶۹۔ دار سخن حافظ طرز در روش خواجو

خواجو کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ سلمان کے زمانے سے غزل میں معاملاتِ عشق و محبت کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی، اخلاقِ حسنہ کی تلقین، ریاکر کی پردہ دری، رندی و مستی کے مضامین بھی غزل میں شامل ہو گئے تھے۔ حافظ نے بھی انھیں قائم رکھا۔

دُنیا کی بے اعتباری:۔

سرود مجلس جمشید گفتہ اند این بود   کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

وفاداری و استواری:۔

حلقہ پیرِ مغانم ز ازل در گوش است | ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود
ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم | از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

سخاوت کی ترغیب :-

اے نورِ چشمِ من سخنے ہست گوش کن | تا ساغرت پر است بنوشان و نوش کن

مظلوم کی فریاد :-

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات | با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد
سوز آہ سینۂ سوزانِ من | سوخت ایں افسردگانِ خام را

مستی و رندی، جوش و ولولہ خواجہ کے کلام کا وہ نشہ ہے۔ جس سے فارسی شاعری مخمور نظر آتی ہے۔

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم | فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد | من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم
ساقیا برخیز و در دہ جام را | خاک بر سر کن غمِ ایام را
عاقبت منزل ما وادیِ خاموشاں است | حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز
گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں | کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم
کہ برد بہ نزدِ شاہاں زمنِ گدا پیامے | کہ بکوئے مے فروشاں دو ہزار جم بہ جامے

---

(۸)

آخری دورِ تیموریہ

دولت شاہ سمرقندی | امیر دولت شاہ کے والد امیر علاء الدولہ بختی شاہ غازی سمرقندی شاہ رُخ کے خاص مصاحبین میں تھے۔ دولت شاہ ابو الغازی سلطان حسین اور وزیر میر علی شیر نوائی کے دامن دولت سے وابستہ تھا۔

تذکرۃ الشعراء جو ایران کے شعراء کا نہایت معتبر تذکرہ شمار کیا جاتا ہے اور قدیم سے آج تک کی تمام تحقیق کا ماخذ ہے ۱۴۸۷ء میں ترتیب دیا گیا۔ اس تذکرہ میں ۱۴۰ شعراء اور اُن کے قدردان سلاطین اور امراء کا حال ہے۔ حالات زندگی کے ضمن میں جو قصص و حکایات بیان کی گئی ہیں۔ اس سے زمانہ کی معاشرت اور سیاسی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

دولت شاہ نے شعراء تذکرہ کے متعلق اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے اور آج یہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ اس کی رائے اکثر و بیشتر صحیح ہے۔

کتاب کی طرزِ تحریر اور زبان اگرچہ رنگین اور مرصع ہے لیکن ایسی گنجلک نہیں کہ مطلب خبط ہو جائے۔ بحثیت مجموعی نہایت صاف اور عمدہ ہے۔ تذکرۃ الشعراء فارسی زبان کی ایک اہم اور قابلِ قدر کتاب ہے۔

جامی
۱۴۱۴ء — ۱۴۹۲ء

مُلّا نورالدین عبدالرحمٰن جامی، خراسان کے قریب قصبہ جام میں ۱۴۱۴ء میں پیدا ہوئے۔

پروفیسر براؤن کے بقول جامی کی لیاقت کا دوسرا آدمی ایران میں پیدا نہیں ہوا اس لئے کہ "اُن کی ذات میں شاعری، علم و فضل، اور تصوف بیک وقت جمع تھا۔"

اس زمانہ کے سلاطین، امراء، شعراء اور اہل کمال جامی کا بے حد احترام کرتے تھے۔

جامی نے تمام علوم متداولہ میں دستگاہ کامل حاصل کی اور بہت جلد مشاہیر علماء میں ان کا شمار ہونے لگا۔ لیکن اس علم و فضل کے باوجود ان کی طلب ہنوز تشنۂ سکون تھی۔ بالآخر انھوں نے حضرت سعدالدین محمد کاشغری کے ہاتھ پر بیعت کی اور مدارج تصوف طے کر کے خرقہ حاصل کیا۔

مُلّا جامی کی نظم و نثر کی تصانیف کثرت سے ہیں اور ہر صنفِ شاعری پر ان کا کلام موجود ہے۔ ان کی ہر دو قسم کی تصانیف میں تصوف کا رنگ غالب ہے آپ کا انتقال ۱۴۹۲ء میں ہوا۔

اُن کی تصانیف کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

نثر:۔ نقد النصوص۔ شیخ صدر الدین کی کتاب نصوص کی شرح جو ۱۴۵۹ء میں لکھی گئی نفحات الانس، تذکرۂ صوفیائے کرام (۱۴۷۸ء)، شواہد النبوت (۱۴۸۰ء) اشعۃ اللمعات، عراقی کی مشہور تصنیف لمعات کی شرح (۱۴۸۱ء) بہارستان، گلستان سعدی کے طرز پر لکھی گئی۔ (۱۴۸۷ء) اس کے علاوہ انھوں نے قرآن شریف کے مختلف اجزا کی تفسیر بھی لکھی ہے۔ حدیث کے متعلق بھی ایک تصنیف ہے۔ مختلف رسالے، موسیقی علم البیان، عروض، عربی قواعد پر اور منشآت مجموعہ خطوط بھی اگرچہ مبسوط تصانیف نہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مکمل ہے۔

نظم:۔ اساتذۂ قدیم کے اصول کے مطابق ملّا جامی نے بھی مثنویوں کا ایک سلسلہ تصنیف کیا ہے۔ اُن کی تعداد سات ہے۔ اور ہفت اورنگ کے نام سے مشہور ہیں۔

(۱) سلسلۃ الذہب سلطان حسین کے لئے لکھی گئی۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں اعتقادات، دوسرے میں عشق حقیقی و مجازی کا فرق، تیسرے میں سلاطین اور حکماء کے حالات۔ زبان سلیس اور اشعار صاف ہیں۔

(۲) سلامان و ابسال۔ ایک تمثیلی قصہ ہے۔ جا بجا محاکات سے کام لیا ہے۔ اور اکثر جگہ کامیابی حاصل کی ہے۔ زبان کی سلاست اور طرز ادا کی جدت نے مثنوی کو اور بھی بہتر بنا دیا ہے۔

(۳) تحفۃ الاحرار۔ پند و نصیحت کا خزانہ ہے۔ (۴) سبحۃ الابرار۔ حقائق تصوف و معرفت بڑی خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ (۵) لیلیٰ مجنوں عشقیہ مثنوی ہے

(۶) خرد نامہ سکندری۔ بوستان سعدی کا تتبع ہے۔ مگر اس سے بہت پست۔

(۷) یوسف زلیخا۔ اس کو پڑھ کر بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر مولانا جامی ہفت اورنگ کی جگہ صرف یہ ایک مثنوی لکھ کر چھوڑ جاتے تو اُن کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی تھی اگرچہ قصہ تاریخی اعتبار سے ناقابل اعتبار ہے مگر جہاں تک شاعری کا تعلق ہے۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے جو بزم عشق سجائی ہے۔ اس کی مثال فارسی ادب میں مشکل سے

ملے گی۔ بعض اشعار اس قدر برجستہ ہیں کہ ضرب المثل ہو کر رہ گئے ہیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

غرض یہ مثنوی مولانا کا شاہکار ہے۔ اور ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ ان کے علاوہ ایک دیوان ہے۔ جس کے تین حصے ہیں۔ ابتدائی زمانہ کا کلام فاتحۃ الشباب وسطِ عمر کا کلام واسطۃ العقد اور آخر عمر کا خاتمۃ الحیات۔ غزلیات میں عشقِ حقیقی اور استغراق کا رنگ غالب ہے۔

طرفِ باغ و لبِ جو لبِ جام است اینجا   ساقیا خیز کہ پرہیز حرام است اینجا

شیخ در صومعہ گر مست شد از ذوقِ سماع   من و میخانہ کہ ایں حال مدام است اینجا

میکشی تیغ کہ سازی دل مارا بدو نیم   تیغ بگذار کہ یک غمزہ تمام است اینجا

خوباں ہزار داز ہمہ مقصودِ من یکیست   صد بار اگر کنند بہ تیغم سخن یکے ست

آنجا کہ لعلِ دلکشِ شیریں دہد فروغ   یاقوت و سنگ در نظرِ کوہکن یکے ست

دوانی
۱۴۲۷ء ۱۵۰۲

جلال الدین دوانی قصبہ دوان میں ۸۳۰ھ (۱۴۲۷) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی جو قاضی وقت تھے

اس کے بعد ملا محی الدین انصاری، خواجہ حسن شاہ اور سید شریف سے درسیات کی تکمیل کی اور زمرہ علماء میں شمار کیے جانے لگے۔ پھر عہدہ قضا پر فائز ہوئے اور بعد میں مدرسہ دار الایتام کے صدر مقرر ہوئے اور آخر میں سلاطین آق قونیلو کے عہد میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ نظم بھی کہتے تھے اور فانی تخلص تھا۔ لیکن ان کی شہرت نثر کی وجہ سے ہے۔ ان کی تصانیف میں اخلاق جلالی جو محقق طوسی کی اخلاق ناصری کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ سب سے بہتر ہے۔ یہ ۸۶۶ھ میں لکھی گئی اور اوزون حسین کے نام معنون کی گئی۔ اخلاق جلالی کی عبارت مشکل اور طرز ادا عالمانہ ہے۔ جملے طویل اور مباحث دقیق ہیں۔

...ی تصانیف یہ ہیں: شرح ہیاکل۔ شیخ شہاب الدین مقتول کی کتاب ہیاکل کی شرح، شرح عقائد عضدی اور نور الہدایہ۔

واعظ کاشفی
(۱۵۰۵)

کمال الدین حسین انکا نام تھا۔ خطابت پیشہ تھا۔ اس لئے واعظ کہلاتے تھے۔ علم القرآن اور حدیث پر پورا عبور حاصل تھا۔ سلطان حسین نے خراسان سے بلا کر ہرات کا خطیب مقرر کیا۔ نجوم میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۵۰۵ء میں ہرات میں انتقال کیا۔

واعظ اس زمانہ کے نہایت کامیاب نثر نگار تھے۔ عبارت میں ایسی رنگینی ہے اور جا بجا ایسے موزوں اشعار چسپاں کرتے ہیں کہ نظم کا لطف آجاتا ہے آپ کی عبارت کے متعلق یہ تبصرہ صحیح ہے کہ "نہ گلستان کے سے بے تکلف اور سہل ممتنع فقرے ہیں۔ اور نہ ظہوری کے پیچ در پیچ استعارات و صنائع ہیں۔ اور دیگر اعتدال کیا تھا مرادف الفاظ اور جملے ہیں۔ مگر تکلیف دہ نہیں"۔

ان کی تصانیف کا تذکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

روضۃ الشہدا۔ شہدائے کربلا کے حال ہیں لیکن تاریخی لحاظ سے نہایت ناقابل اعتبار ہے۔ اخلاق محسنی علم الاخلاق کے متعلق ہے۔ عالمانہ بحث ہے۔ مگر دلچسپی اور توضیح کے لئے حکایات بھی درج ہیں۔ انوار سہیلی، کلیلہ و دمنہ کا قصہ نہایت شیریں زبان میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ خلاصہ مثنوی مولانا روم موسومہ بہ لب لباب اور تفسیر قرآن شریف بھی لکھی ہے۔

---

(۹)

دورِ ہندیہ

امیر خسرو
۱۲۵۳—۱۳۲۵

ایرانی شعراء اور نقاد ہندوستانی شعراء اور مصنفین کے متعلق سخت متعصبانہ رائے رکھتے ہیں۔ لیکن صرف امیر خسرو ایسے تھے کہ آپ کو خود ایرانیوں نے طوطیٔ ہند کا خطاب دیا تھا۔

امیر خسرو امیر سیف الدین محمود کے لڑکے تھے۔ ۱۲۵۳ء میں ایٹہ کے ضلع میں پیدا ہوئے۔ علوم درسیہ کی تکمیل ۲۰ برس کی عمر میں کی۔ فطرت نے موزوں طبیعت عطا کی تھی۔ بہت جلد نہایت عمدہ شعر کہنے لگے۔ اور کشلو خاں کے دربار سے تعلق پیدا کر لیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد بغرا خاں کے دربار میں

چلے گئے۔ اور اس کے بعد سلطان محمدؒ بن سلطان بلبن کے مصاحب ہو گئے۔ خسرو نے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور ان میں سے ہر ایک اُن سے بے انتہا انس رکھتا تھا اور اُن کے کمال کی قدر کرتا تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں خسرو کی ماں نے اُن کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا دہلویؒ کے قدموں میں ڈال دیا۔ آپ کی روحانی تعلیم انھیں کے ظلِ عاطفت میں ہوئی۔ خسرو کو مرشد سے اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے بغرا خاں کے ساتھ بنگال جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور دہلی میں شیخ کے پاس مقیم ہو گئے۔ اکہتر سال کی عمر میں ۱۳۲۵ء میں انتقال کیا اور اپنے پیر کے پہلو میں دفن ہوئے۔

امیر کی زندگی میں بظاہر بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو ہم انھیں مصاحبت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ پھر وہ کسی دربار میں بلند بال قصیدہ پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہیں۔ اور کبھی دیہاتی عورتوں کو کہ مکرنیاں، اور پہیلیاں سناتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ "ظاہر" تھا ورنہ حقیقت میں وہ ایک صوفی کامل اور عاشق الٰہی تھے۔ آپ کو اپنے مرشد کی محبت میں جو غلو تھا وہ اس کا شاہد ہے۔

ان کا طرز ادا سلیس اور موثر تھا۔ تصنع اور تکلف سے یکسر پاک، دل سے بات نکلتی تھی اور دل میں اُتر جاتی تھی۔ غزلیات کی بحر اکثر چھوٹی ہوتی تھی الفاظ آسان، طرز ادا دلفریب، تخیل کافی بلند، واردات عشق کا بیان والہانہ طور پر اور وعظ و نصیحت کے ساتھ تصوف کی چاشنی ہوتی تھی۔ انھیں خصوصیات نے ان کو سعدی کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ قصیدہ میں کمال اسمعیل کی پیروی

کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا بہترین نمونہ پنج گنج (پانچ مثنویاں) ہے۔ نہایت پرگو تھے۔ پانچ دیوان اور نو مثنویاں یادگار ہیں۔ نثر میں ایک کتاب اعجاز خسروی لکھی جس میں نثر نویسی کے طریقے صنائع بدائع اور مختلف طرز ادا بیان کئے ہیں فارسی کے تقریباً تمام اساتذہ کسی ایک صنف میں کمال رکھتے ہیں۔ اور دوسری صنف کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بخلاف اس کے امیر قصاید، مثنوی، اور غزل تینوں میں یکساں اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔ جامی نے بہارستان میں لکھا ہے کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا ہے۔

امیر کا دوسرا کمال "وصف نگاری" ہے۔ مختلف چیزوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ قرآن السعدین میں کاغذ، قلم، کشتی وغیرہ پر کثرت سے نظمیں ہیں۔

خسرو کی تشبیہات میں ایک نیا لطف ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے ہندوستان کی زبان برج بھاشا سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ کبوتر کی مست خرامی ہنس کی رفتار وغیرہ۔

ذیل میں ان کی تصنیفات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

پنج گنج۔ (۱) مطلع الانوار (۲) شیریں خسرو (۳) لیلیٰ مجنوں (۴) آئینہ سکندری (۵) ہشت بہشت، تغلق نامہ (غیاث الدین تغلق کے زمانے کا حال ہے) تاج الفتوح نہ سپہر۔ افضل الفوائد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاءؒ) مناقب ہند، تاریخ دلی

ذیل کے انتخاب سے ان کے کلام کا اندازہ ہوگا۔

سرے دارم کہ ساماں نیست او را | بہ دل دردے کہ درماں نیست او را
گاہ مردن ہشنیدہ ام محمود | گفت ردیم سوئے ایاز کنند

ماجرائے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال | اے سرت گردم چہ می پرسی بہ دشواری گذشت
زانوش خسرو بہ زیر سر نیافت | سر نہادہ بہ سر زانو بخفت
ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ | نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد | مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

حسن دہلوی

دہلی میں نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر خسرو کو ان سے بےحد محبت تھی۔ اُن کو دیکھ کر جیتے تھے۔ گویا ایک جان دو قالب تھے سلطان محمد قاآن کے دربار میں امیر خسرو کے ساتھ حسن بھی تھے۔ تاریخ فرشتہ میں ان کی بے پناہ محبت کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ جب امیر اور حسن کے تعلقات کا زیادہ چرچا ہوا تو خان شہید نے حسن کو امیر سے ملنے سے منع کر دیا مگر یہ نہ مانے اس نے غصہ میں آکر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے۔ حسن خسرو کے پاس گئے۔ سلطان کو بھی خبر ہو گئی۔ اس نے خسرو کو بلایا۔ جب دربار میں آئے تو پوچھا کیا حال ہے امیر نے ہاتھ کھول کر دکھایا اور کہا تھا:۔

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے اسی جگہ خسرو کے بھی نشان تھے۔ ان کے کلام میں صرف عشق کی گرمی ہے اس کے اثر سے بلا کا سوز و گداز ہے:۔

از حسن این چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست	این سخن را چہ جواب است تو ہم می دانی
تلخ کردم جہانیاں را خواب	زاں دعا ہا کہ مستجاب نبود
اے حسن یار گر خطائے کرد	ہم شکایت از و صواب نبود
گفتی کہ چہ احوال دل خویش نگوئی	من خود کنم آغاز بہ پایان کہ رساند

فیضی

1547ء — 1595ء

ابو الفیض نام تھا۔ اوّل فیاضی تخلص اختیار کیا۔ اس کے بعد فیضی۔ شیخ مبارک ناگوری کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ 1547ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوا اور درسیات کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ فیضی کو اکبر کے دربار میں بڑا اعزاز حاصل تھا۔ اکبر کے نورتن میں فیضی کا رتبہ بہت بلند تھا۔ 1588ء میں ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا۔ 1595ء میں انتقال کیا۔

فیضی کی تصنیفات کی تعداد ۱۰۱ بتائی جاتی ہے۔ جن میں مشہور یہ ہیں۔

مثنویات:۔ مرکز ادوار، سلیمان و بلقیس، نل و من، ہفت کشور۔ اور اکبر نامہ

(یہ مثنویاں بطور خمسہ نظامی کے جواب کے اکبر کے بیحد اصرار پر لکھی گئیں)
سواطع الالہام، قرآن شریف کی بے نقط تفسیر، لطیفہ فیضی، انشا کا مجموعہ۔
طباشیر الصبح (دیوانِ غزلیات) مقاصد الشعرا، تذکرہ شعرا، مہابھارت،
(ترجمہ فارسی) لیلاوتی، علم ریاضی پر ایک رسالہ۔

فیضی عالم متبحر تھا۔ اور عالمانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی،
کو اس سے سخت عداوت تھی۔ لیکن اعتراف کمال میں کبھی تامل نہیں کیا۔ کہتا ہے۔
"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت، و طب و انشا
عدیل در روزگار نداشت" مثنوی کے لئے لکھا ہے۔
"دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر گفتہ باشد"

نثر میں عبارت سادہ اور بے تکلف ہے۔ تصنع اور بے جا لفاظی نہیں ہے
اور طول، طویل جملوں سے الجھاؤ پیدا نہیں کیا ہے۔ نظم میں غزل کا رنگ
صاف اور موثر ہے۔ خیالات بلند اور طرز ادا دلنشین ہے۔ فخریہ، عشقیہ، اور
فلسفیانہ مضامین بڑے جوش سے بیان کئے ہیں۔ تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے
مصائب کا تذکرہ کرتا ہے کہ یہ رحمت ہیں۔ اس لئے امتحان کے طور پر نازل کی
گئی ہیں۔

روئے کشادہ باید و پیشانئ فراخ — آنجا کہ لطمہائے ید اللہ میزنند

مصائب عشق کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

در دشت آرزو بنود سیم دام و دد — راہے است ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو

غزل کا عام انداز یہ تھا۔

عشق تا پائے بفشرد در اندیشہ ما — ہمہ معشوق ترا دو ز رگ و ریشہ ما
از تفِ بادۂ ما بال ملائک بگداخت — وائے آں روز کہ برتے جہد از شیشہ ما

عجب تراز دلِ فیضی ندیدہ ایم طلسم — کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص

عرفی

۱۵۵۶ء — ۱۵۹۱ء

سید جمال الدین عرفی ۱۵۵۶ء میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ عرفی تخلص اس لئے اختیار کیا کہ اس کے والد ایران میں غیر مذہبی ادارہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب عرفی ہندوستان آیا۔ تو فیضی کے پاس فتح پور سیکری گیا۔ اس نے بڑی آؤ بھگت کی اور بہت خاطرداری سے رکھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد حکیم میر ابو الفتح گیلانی سے جو اکبر کے دربار میں ایک ممتاز عہدہ پر مامور تھے تعلق پیدا کیا۔ اور اُن کی قدردانی سے بہرہ مند ہوا۔ عرفی نے حکیم کی معیت میں رہ کر بہت ترقی کی۔ اس کا شاعرانہ کمال حکیم کی تربیت اور تنقید کا فیضان ہے۔ چنانچہ حکیم نے ایک بار خانخانان کو لکھا "ملا عرفی بسیار ترقی کردہ اند" ۱۵۸۹ء میں حکیم نے انتقال کیا۔ عرفی کو بیحد صدمہ ہوا۔ اس کے بعد وہ خانخانان کے دربار میں آگیا۔ یہاں بھی بڑی قدر ہوئی۔ ایک بار ایک قصیدہ پر ۰، ہزار روپیہ انعام پایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو شہزادہ سلیم سے محبت تھی۔ اور اس کے ثبوت میں اس کا قصیدہ،

صباح عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم ۔ گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

پیش کیا جاتا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے اس کو ۳۶ سال کی عمر میں ۱۵۹۱ء میں زہر دیا گیا۔ لاہور میں دفن ہوا مگر اس کی خواہش تھی کہ۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم ۔ اگر بہند ہلا کم کنی و گر تتار

یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ ایک شخص لاہور آیا۔ اور عرفی کی قبر کو اپنے بھائی کی قبر سمجھ کر کھود ڈالا اور اس کی ہڈیاں نجف لے جا کر دفن کر دیں۔

عرفی بلا کا خوددار شاعر تھا۔ دوسرے کی مدح کسی طرح گوارا نہ تھی۔ مگر پھر بھی مدح پر مجبور تھا۔ کوئی قصیدہ ایسا نہیں جس میں اس نے ممدوح کی تعریف سے پہلے اپنی تعریف نہ کی ہو اور اپنے نسب اور علم و فضل پر فخر نہ کیا ہو۔

جہاں تک شاعرانہ کمال کا تعلق ہے یہ مسلم ہے کہ عرفی کو ہر صنف شاعری میں کمال حاصل تھا۔ لیکن وہ قصیدہ اور غزل کے میدان کا مرد تھا۔ اس کے کلام کی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) بلند آہنگ الفاظ، چست بندشیں، ایجاز و اختصار، اعلیٰ مضامین عرفی کا طرۂ امتیاز ہیں۔

آہنیں پنجہ تیغش با جل گفت کہ من
موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم
گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

(۲) نادر تراکیب سے اس نے پورے پورے فقروں کا کام لیا ہے۔ جو مطلب جملوں میں ادا ہوتا ایک ترکیب میں ادا کیا ہے۔

بہ برقع مہ کنعاں کہ بود حسن آباد
بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار

(۳) خوبصورت اور نئی تشبیہات اور استعارات

دلم چو رنگ زلیخا شکستہ در خلوت
غمم چو تہمت یوسف دویدہ در بازار

عرفی کو محاکات پر جو قدرت حاصل ہے وہ بہت کم کو میسر ہوئی ہے دیکھئے اس قصیدہ میں کتنا جوش، تسلسل اور فصاحت ہے۔

سپیدہ دم چو زدم آستیں بشمع شعور
شنیدم آیت استفتحوا ز عالم نور

(۵) تخئیل کی بلند پروازی، خیالات کی ندرت

قطرہ ہا کش دم رفتن چکد از پیشانی
شبنم آسا ش نشیند گہ رجعت بکفل

(۶) معاملات عشق و محبت کا بیان۔

طغیان نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل
در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

(۷) فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات۔

حد کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست
ویں سخن نیز باندازۂ ادراک منست

ابو الفضل
(۱۵۵۱ — ۱۶۰۲)

ابو الفضل نام اور علامی تخلص تھا۔ شیخ مبارک کے دوسرے بیٹے تھے۔ اور فیضی کے چھوٹے بھائی ۱۵۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے اور اس قدر ترقی کی کہ وزیر اعظم کے مرتبہ تک پہنچ گئے۔ بادشاہ کے مزاج میں بے حد دخل تھا شہزادہ سلیم کو آخر عمر میں سخت عداوت ہو گئی تھی۔ دکن کی مہم سے واپسی میں زنگھ دیو سے ۱۶۰۲ء میں قتل کرا دیا۔

تصانیف میں اکبر نامہ، آئینِ اکبری اور انشائے ابو الفضل مشہور ہیں۔
اکبر نامہ اور آئینِ اکبری میں سلطنت کا حال نہایت تفصیل سے رسم و رواج، نظام
سلطنت اور اصلاحات مذہب وغیرہ کے عنوانات کے ماتحت لکھا ہے۔ ان
کتابوں میں اس کا التزام رکھا ہے کہ عربی کے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔
خالص فارسی کے محاورات بکثرت ہیں۔ اکثر نئی نئی اصلاحات بھی تراشی ہیں
اکبر نامہ کی عبارت مشکل اور فقرے طویل ہیں۔ آئینِ اکبری میں چست
تراکیب، ایجاز و اختصار، شیرینی و وضاحت سب کچھ موجود ہے۔ اور ابو الفضل
کی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ انشائے ابو الفضل میں نہایت طویل جملے لکھے ہیں۔ جو
اکثر ایک ایک صفحہ پر حاوی ہیں۔ عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ مرادفات اور
تکرار بے حد ہے۔

آئینِ اکبری کا نمونہ یہ ہے۔

"راہے بہ نہاں خانۂ معنی بردہ اند، و روشن ضمیر شان تا لشکاہ ایزدی فیض
لاکن بسیارے گراں مایگی نشناشند، و بہ آرزوئے کمتر خواستہ میفزوستند،
و در ستایش فرد مایگانِ روزگار بسپرند، و بہ نکوہش فرہیدہ مردم زباں برآلایند،
دگر نہ پیوند الفاظ بس شگرف باشد چہ جائے دریافت والا معانی"۔

ملا بدایونی ملا عبدالقادر نام۔ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ بلگرامی نے
شیخ مبارک کا شاگرد بتایا ہے۔ اکبر کے پیش امام تھے۔ مذہبی
معاملات میں بہت سخت تھے۔ اکبر کے مذہبی رجحانات کا سبب فیضی اور ابو الفضل
کو سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے ناراض تھے۔ شیخ حاتم سنبھلی کے مرید تھے۔
مہابھارت، اور بحر الاسمار کا فارسی میں ترجمہ کیا ان کا اصلی کارنامہ منتخب التواریخ
المعروف بہ تاریخ بدایونی ہے۔ اکبر کے زمانہ کے تفصیلی واقعات لکھے ہیں۔
زبان سلیس اور سادہ ہے۔ لیکن ہر اس چیز پر نہایت سختی سے اعتراض اور تنقیص
کی ہے جس کو وہ پسند نہ کرتے تھے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے۔

"او و حسین ثنائی از شعر عجب طابع دارند کہ ہیچ کوچہ و بازارے نیست

کہ کتاب فروشاں دیوانِ ایں دو کس را در سرِ راہ گرفتہ نہ ایستند و عراقیان و ہندوستانیاں نیز بہ تبرک می خرند"

صائب مرزا محمد علی نام اصفہان کے رہنے والے تھے۔ جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آئے۔ کشمیر میں ظفر خاں والئ کشمیر سے ملاقات ہوئی۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو اس قدر پسند کیا کہ بہت جلد آقا و ملازم کے تعلقات مٹ گئے اور یک جان دو قالب ہو گئے۔ اپنے قصائد میں اس طرح مدح کرتا ہے جیسے کوئی محبوب کی تعریف کرتا ہے۔

شاہجہاں کے زمانے میں ظفر خاں کے ساتھ دہلی آیا۔ وہاں سے شاہجہاں اور ظفر کے ساتھ دکن گیا۔ واپسی پر ظفر خاں کو پھر کشمیر کی صوبہ داری پر مامور کیا گیا۔ یہ اس کے ساتھ گیا۔ لیکن کچھ عرصہ رہ کر اصفہان چلا گیا اور وہیں انتقال کیا۔

صائب کے متعلق مولانا شبلی کی رائے ہے: "ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی۔ مرزا صائب پر ختم ہو گئی۔ صرف قاآنی کا استثنا رہا ہے" اس میں شک بھی نہیں کہ فارسی غزل میں صائب ایک طرز خاص کا موجد ہے جس کی تقلید آج تک کسی سے نہ ہو سکی۔ کوئی مضمون ہو۔ فلسفہ ہو یا معاملہ بندی۔ تصوف ہو یا رندی، حقیقت ہو یا مجاز وہ اپنی تمثیل سے ایک خاص لطف پیدا کر دیتا ہے۔ اور فصاحت و سلاست برقرار رہتی ہے۔

جذبہ عاشق اثر در سنگ خارا می کند	کوہکن معشوق خود از سنگ پیدا می کند
صحبت ناجنس گرجاں بخشدت صائب مرد	آب را دیدی کہ ماہی را بدام افگند و رفت
از سعی کارِ عشق شود خام بیشتر	پیچد بہ مرغ بال فشاں دام بیشتر
چشم بر صنع الٰہی باز کن لب را ببند	بہتر از خواندن بود دیدن خطِ استاد را

اس رنگ سے جدا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

کہ گذشت ازیں بادیہ دیگر کا مرد ز	نبض رہ می طپید و سینۂ صحرا گرم است
چشمِ عاشق ز تماشائے تو چوں سیر شود	برنگہ سلسلہ جنباں نگاہ دگر است
ہم اینجا صلح کن با من۔ چہ لازم	کہ در محشر ز ما شرمندہ باشی

عالم بے خبری طرفہ بہشتے بود است — حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم

ابوطالب کلیم | ابو طالب نام اور کلیم تخلص تھا۔ ہمدان میں پیدا ہوا۔ شیراز میں تحصیل کی۔ اور جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔

شاہ نواز خاں کے دربار میں باریاب ہوا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد ایران واپس چلا گیا۔ دو برس کے بعد پھر آیا اور اس مرتبہ میر جملہ کے ذریعہ سے شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور انعام و اکرام سے سرفراز ہوا۔ چودہ برس کی محنت کے بعد ملک الشعرائی کا خطاب حاصل کیا۔

شاہ جہاں کے ساتھ کشمیر گیا۔ اور پھر بقیہ زندگی وہیں بسر کی۔ کلیم نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور اکثر ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ قصیدے میں مشکل بندشوں اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا ہے۔ اس کے قصائد کے متعلق مولانا شبلی کی رائے ہے۔ "قصیدہ کی متانت اور بلندی کم ہو گئی اور غزل کا رنگ غالب آگیا" واقعہ نگاری بھی کی ہے۔ اور تخیل سے اچھا کام لیا ہے۔

سحاب از تیر باران بہاری — بہ بستاں جملہ گلہا را نشاں کرد
بنوعے آتش گل در گرفتست — کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

غزلوں میں جوش عشق کم اور مضمون آفرینی زیادہ ہے۔

بسکہ زدیدہ ریختم خونِ دلِ خراب را — گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را
بعد ازیں تاریکیٔ شبہا بخود خوش کن کلیم — شکوہ کم کن در چراغ اختراں روغن نماند
اگر بہ بادیہ گردی نمی روم چہ عجب — جنونِ من نشناسد ز شہر صحرا را

طالب آملی | طالب مازندران کے ایک قصبہ آمل کا رہنے والا تھا۔ ۱۵۱۰ برس کی عمر میں ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کیا۔ فطرت نے اس کو شاعری کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس لئے اسی کو اپنا فن قرار دیا۔

شروع میں مازندران کے حاکم میر ابو القاسم کے دربار سے وابستہ رہا۔ اور اس کی مدح میں متعدد قصائد لکھے۔ یہاں سے کاشان آیا اور مستقل طور پر مقیم ہو گیا۔ یہیں شادی کی اور صاحب تذکرہ میخانہ کا بیان ہے کہ "اس کی شاعری کا نشو و نما یہیں ہوا" یہاں سے طبیعت سیر ہوئی تو مرو آیا اور بلکش خاں گورنر صوبہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ یہاں ہندوستانی سلاطین کی قدر دانی کا شہرہ اس کے کانوں تک بھی پہنچا۔ چنانچہ مرو سے ہندوستان آیا اور مختلف مقامات کی سیر کرتا رہا۔ چنانچہ لاہور کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی موجود ہے۔ ایک دوسرے قصیدے میں "نگاران لاہور و خوبانِ دہلی" کا تذکرہ کیا ہے۔

اس سیر سے فارغ ہو کر قندھار پہنچا۔ یہاں غازی خاں جہانگیر کی طرف سے گورنر تھا۔ ایک قصیدہ نذر کیا۔ غازی خاں نے مقربان خاص میں داخل کیا۔ لیکن اس کا تھوڑے ہی عرصہ بعد انتقال ہو گیا۔ یہاں سے وہ عبداللہ خاں حاکم گجرات کے دربار میں پہنچا۔ اس نے بڑی عزت کی انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ یہاں سے شاپور طہرانی کے توسل سے اعتماد الدولہ کے دربار تک رسائی حاصل کی اور اعتماد الدولہ کے ذریعہ سے جہانگیر کے دربار میں باریابی نصیب ہوئی۔ اور جلد ہی ملک الشعرا کا مرتبہ حاصل کیا۔

طالب نے ۱۲، ۱۳ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ بہت زود گو تھا۔ دو تین گھنٹے میں ۵۰، ۶۰ شعر آسانی سے کہہ لیتا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کی شان میں کئی قصائد محض ایک رات کی محنت کا نتیجہ ہیں۔

طالب کا شاعرانہ کمال تشبیہہ اور استعارات کی موزونیت اور ندرت ہے۔ اس کے تمام کلام میں استعارات کے نگینے اس خوبصورتی سے جڑے ہوئے ہیں کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بے اعتدالیاں بھی ہیں مگر بہت کم۔ ذیل کے انتخاب سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد بست

عشق در اول و آخر ہمہ درد است و صداع — این شرابے ست کہ ہم پختہ وہم خام خوش است

دو لب خواہم یکے در مے پرستی — یکے در عذر خواہی ہائے مستی

دشنام خلق را ندہم جز دعا جواب — ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

بے نیازانہ ز ارباب کرم می گذرم — چوں سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گذرد

خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح — در عمارت گری گنبد دستار خودند

اس کے کلام میں ہندوستانی فارسی کا بھی اثر ہے۔ جہانگیر شراب کو رام رنگی کہتا تھا۔ اس نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

نہ ایم منکر صہبا و لیک می گویم — کہ رام رنگئ ما نشۂ دگر دارد

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام اور نظیری تخلص تھا۔ نیشاپور وطن تھا بچپن ہی میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ اور بہت جلد ترقی حاصل کر کے نام پیدا کیا۔ ایران میں اس کے کمال کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔ لیکن جب ہندوستان میں قدر سخن کی دھوم سنی تو وہاں سے چلا اور سنہ ۱۵۸۴ء میں بمقام آگرہ عبدالرحیم خان خاناں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور سنہ ۱۵۸۸ء میں اکبر کے دربار میں باریابی حاصل کی۔

نظیری احمد آباد میں رہتا تھا۔ اور اپنے مربی کی قدر دانی پر قانع تھا۔ سنہ ۱۵۹۳ء میں اس نے خانخاناں کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جس میں اس نے اس کی قدر دانی کا اعتراف کر کے حج کے لئے زادِ رہ طلب کیا ہے۔

ہمہ عیش ایں جہانے لعنایت تو دیدم — چہ عجب اگر بیابم زتو زادِ آں جہانے

چنانچہ خانخاناں نے تمام سامان مہیا کر دیا اور وہ فریضۂ حج سے سبکدوش ہوا۔ واپسی پر شہزادہ مراد کے دربار سے تعلق پیدا کیا۔ سنہ ۱۶۱۰ء میں جہانگیر نے اس کو دربار میں طلب کیا۔ اگرچہ نظیری تعلقات دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشۂ عافیت میں دینیات اور حدیث کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لیکن دعوت رد نہ کی اور حاضر ہوا۔ ۲ برس کے بعد سنہ ۱۶۱۲ء میں انتقال کیا۔

ذیل میں اس کے کلام کی خصوصیات درج ہیں۔ نظیری واردات اور کیفیات کا بیان مادیات اور محسوسات کے ذریعہ کرتا ہے۔

شکوہ نقصاں داشت فصلے از میاں انداختم   نرخ ارزاں بود کالا در دکاں انداختم
حسن چندے سر بدل شوخی و رعنائی دہد   شہ چو گیرد مملکت اول بہ یغمائی دہد

عشق و محبت کی صحیح تصویر سوز و اثر کی رنگ آمیزی کے ساتھ نظیری کے یہاں کثرت سے ملتی ہے:—

باوجود ناامیدی بسکہ مشتاق توام   مدعی گر مژدہ وصلم دہد باور کنم
بہ مہربانی او اعتماد نتواں کرد   کہ تازہ عاشقم و خاطرش بمن صاف ست
ایں دل کہ در وصال تسلی از و نبود   خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم

محسوسات اور وجدانیات کی دلکش تصویر کشی کرتا ہے۔

زپائے تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست
دل شکستہ دراں کوئے می کنند درست   چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست
ادراک حال ما نگہ می تواں نمود   لختے ز حال خویش بسیما نوشتہ ایم

نظیری کے کلام میں فلسفہ بہت کم ہے لیکن جہاں کہیں ہے بہت عمدہ ہے۔

خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشناختم   باز می باید ز سر گیرم رہ پیمودہ را
تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم   گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست
حور جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست   اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را
حسن ہر سو در لباس دیگرے پنہاں شود   عشق ہر ساعت در آویزد بدامان دگر

اس کے کلام میں روزمرہ اور محاورات بڑی خوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔

(۱) طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر غذیم
(۲) شبنم بروئے سبزہ و نرگس بخواب گیر
(۳) نیم بسمل شدہ بر سر پہ دانۂ ہست

ظہوری ظہور الدین نام اور ظہوری تخلص تھا۔ علوم متداولہ میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد دکن آیا اور عادل شاہی دربار میں رسائی حاصل کی۔ ایک ساقی نامہ برہان شاہ، والی احمد نگر کو نذر کیا۔ ظہوری کو ابراہیم عادل شاہ کی قدر دانی نے فکر دنیا سے آزاد کیا اور ظہوری نے عادل شاہ کو اپنے مصنفات میں جگہ دے کر بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلائی۔

سہ نثر ظہوری، ساقی نامہ اور ایک کلیات جس میں غزلیات اور قصائد ہیں دنیائے ادب میں اپنی یادگار چھوڑے۔ یوں تو ظہوری نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور مضمون آفرینی اور استعارہ بندی کے کرشمہ دکھائے ہیں۔ لیکن تنوع اس کا خاص مضمون رہا ہے۔ اس میں لفظی صناعی اور ضلع جگت کے باوجود سلاست اور فصاحت بھی ہے۔

کعبہ اہل دل ابراہیم باد — قبلۂ نہ چرخ و ہفت اقلیم باد
از مہ نوبست دستے بر زمیں — پیش قدرش چرخ در تسلیم باد
ہمتش ترکیب لفظ کم نخواست — کاف سرکش زاختلاط میم باد
داستاں شد ختم لبتان رخش — غیرت گلزار ابراہیم باد

صاحب آتش کدہ کی رائے ہے کہ "حسن زیادے ندارد امانفصاحت مشہور شد"

ابراہیم عادل شاہ نے ایک کتاب نورس علم موسیقی میں بزبان دکنی لکھی تھی۔ اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور ظہوری نے اس پر تین دیباچے لکھے۔ جو سہ نثر مشہور ہیں۔ اس کی عبارت مرصع اور مقفیٰ ہے۔ جملے طویل اور صنایع بدایع کا نہایت کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ذیل کے ایک جملے میں ۲۲ لفظ ہیں۔ اور ہر لفظ میں ایک صنعت پائی جاتی ہے۔

"سرو سرایانِ عشرت کدۂ قال کہ نورس بہارستان حال کارکام وزبان ساختہ بشہد ثنائے صانع عذب البیان اند کہ نغمہائے نگیں در رگ و پے لے ذوانیدہ"

ظہوری اس رنگ کے خاتم تھے۔ ان کے بعد کوئی دوسرا ایسی نثر نہ لکھ سکا۔ اس نثر کے متعلق صاحب خزانہ عامرہ کی رائے ہے کہ "از جواہر زواہر گزرانیدہ"

قدسی محمد جان نام اور قدسی تخلص تھا۔ مشہد مولد و وطن تھا۔ شاہجہان کے زمانہ میں (۱۶۳۲ء) ہندوستان آیا۔ اور دربار میں باریابی حاصل کر کے ملازم ہو گیا۔ لیکن مغلیہ قدر دانی کے مزہ سے کام و دہن آشنا بھی نہ ہوئے تھے کہ چار سال رہ کر (۱۶۴۶ء) میں انتقال کیا اور لاہور میں دفن ہوا۔

قصیدہ نگاری میں کمال حاصل تھا۔ اور ایک خاص رنگ ایجاد کیا۔ جس کا وہ خود بانی اور خود ہی خاتم تھا۔ اس کے کلام میں جدت تخیل ہے۔ بعض قصائد میں اس نے بغیر گریز کے مدح شروع کر دی ہے جو اس کے شاعرانہ کمال کا ایک عمدہ نمونہ ہے:—

زبسکہ کشید است نم ز ابر مطیر — تواں کشید زسنگ آب ہمچو موز خمیر
چو خاک پیرہن غنچہ باد پیرایان — کنند رخنہ دیوار راز گل تعمیر
سحاب شست لب غنچہ را بجذب آب — برائے آنکہ زند بوسہ بر رکاب امیر

ایک مثنوی شاہجہاں کے حال میں لکھی ہے۔ بادشاہ نامہ صاحبقران ثانی صاف اور سلیس زبان میں ہے۔ طرز ادا بھی خاصا دلکش ہے بعض مقامات پر منظر کشی بہت عمدہ کی ہے۔ مبالغہ اور تصنع نے اس کی قدر و قیمت کم کر دی کشمیر کی تعریف لکھتا ہے:—

نسیمش زصنعت بہار آفریں — قلمہائے نخلش نگار آفریں
چو گلہائے رعنا دریں لالہ زار — خزاں را پس پشت کردہ بہار
چو رخسار ساقی ز جام شراب — چمن در گرفت از گل آفتاب

شد از عکس گل بسکہ خوشبوئے آب — بدو چشمہ آب حوض گلاب

نعمت خان عالی مرزا محمد نام تھا۔ حکیم فتح الدین کے بیٹے تھے آباد اجداد شیراز کے نامور اطبا رہتے۔ اگرچہ نعمت خاں ہندوستان میں پیدا ہوا لیکن بچپن ہی میں اس کے والدین ایران لے گئے تھے۔ وہاں سے تحصیل علم کر کے ہندوستان واپس آیا۔ اور شہنشاہ اورنگ زیب

کے دربار میں ملازمت حاصل کی۔ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے حیدرآباد فتح کیا۔ عالی نے ایک قطعہ تاریخ پیش کیا اور انعام حاصل کیا۔

از نصرت بادشاہ غازی گردید دل جہانیان شاد
آمد بقلم حساب تاریخ شد فتح بجنگ حیدرآباد

۱۶۹۲ء میں عالی داروغہ مطبخ کے عہدہ پر مقرر ہوا اور نعمت خاں کا خطاب پایا۔ بعد میں حاکم خزانہ مقرر ہوا۔ مقرب خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد شاہ عالم نے اپنی ملازمت میں رکھا اور شاہ نامہ لکھنے کی خدمت پر مامور کیا مگر ۱۷۰۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

نظم و نثر میں وقایع نعمت خاں عالی، جنگ نامہ، مضحکات، اور مجموعہ قصاید و غزلیات یادگار چھوڑے۔ عالی دورِ آخر کے بلند مرتبہ شاعر اور نثر نگار تھے۔

جنگ نامہ میں معظم و اعظم شہزادگان اورنگ زیب کی خانہ جنگی کا حال لکھا ہے۔ یوں طرز تحریر دستور زمانہ کے مطابق مشکل اور پیچیدہ ہے۔ طویل فقرے مرادفات کی کثرت، استعارات کی بھرمار لیکن جہاں کہیں آسان اور سلیس عبارت ہے۔ سہل ممتنع معلوم ہوتی ہے۔

"دنیا نمودے است بے بود و بودے است بے وجود، عالم ہمہ اسم است بل سراسر طلسم"

وقایع میں اورنگ زیب کی لڑائیوں کا حال ہے۔ عبارت سہ نثر ظہوری سے ملتی ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ عالی شیعہ ہے اور اس کتاب میں اورنگ زیب کے خلاف طعنہ زنی کی ہے۔ اُن کو چھپانے کے لئے صنایع کا استعمال کیا ہے۔ اس سے تحریر اور گنجلک ہو گئی ہے۔ نمونہ دیکھئے۔

"دید کہ مدرس کشافِ صبح دَر صفحہ صدق و صفا چوں قاضی بیضا تفسیر والشمس وضحیٰہا بخطِ شعاعی آفتاب بر صفحہِ روزگار نگاشت"

ذیل میں ایک غزل کا انتخاب دیا جاتا ہے۔ اس سے کلام کا اندازہ کیا

جا سکتا ہے۔

عکس یارم کہ بنمائے ندیدن رفتم | عمر صبحم کہ بیک آہ کشیدن رفتم
جلوہ کرد کہ از حسرت دل آب شدم | قطرہ گشتم و آخر بہ چکیدن رفتم
خاک بودم کہ مگر یار گزارے بکند | گلشنے گشتم و بیہودہ بچیدن رفتم
عالی افسوس کہ بداد دستارعمر خطاست | نہ قلبم کہ بدتنام خریدن رفتم

ناصر علی

ناصر علی نام علی تخلص تھا۔ سرہند کے رہنے والے تھے۔ شروع میں سیف خاں صوبہ دار الہ آباد کے یہاں ملازم تھا۔ لیکن چند سال ہی رہ کر سرہند واپس آگیا۔ ذوالفقار خاں بھی اس کے قدر دانوں میں تھا۔

اس کے ساتھ بیجاپور اور کرناٹک وغیرہ میں رہا۔ اور بالآخر دہلی میں آخری ایام زندگی بسر کرنے کے ۱۶۹۷ء میں انتقال کیا۔

ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار چھوڑی۔ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ صناعی اور لفظی کاریگری ختم کر دی ہے۔ سلاست کا خاتمہ کر دیا۔ استعارات کی جکڑ بندی نے نزاکت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رکھی۔ اگر کوئی استادانہ کمال نظر آتا ہے تو وہ جدت ادا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ صفت تمام عیوب کی پردہ پوشی کر لیتی ہے۔

نیست غیر از عشق دل سوزے من افسردہ را | شعلہ جنبش می دہد بنفس چراغ مردہ را
عشق از پردہ برون آمد و آوازم داد | برد از بزم جہاں دور و بہ پروازم داد
کسے کہ درد جدائی کشیدہ می داند | کہ خار خشک رگ جان شاخ عریان است

تخئیل کی بے اعتدالی ملاحظہ ہو۔

از بسکہ سنگ تفرقہ ہا در سراغ ماست | چوں شیشہ شکستہ فروغ چراغ ماست
حسرت گرم شکایت جوش زد دیدن بچشمے | نفس شوخ است ہمراز دہنخواہد زبان اینجا

حزیں
۱۶۹۲—۱۷۶۶

محمد ابن ابی طالب نام اور حزیں تخلص تھا۔ شیخ زاہد گیلانی کی اولاد میں تھا۔ اس کے والد ابو طالب، گیلان سے اصفہان آئے اور یہیں تعلیم حاصل کی اور شادی کی۔ شیخ حزیں

۱۶۹۲ء میں پیدا ہوئے اور یہ ابھی ۲۳ برس ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔

حزیں اسی وقت سے علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ۱۷۲۲ء میں اصفہان پر افغانوں نے حملہ کیا اور امن امان ختم ہو گیا۔ اس ہنگامہ سے گھبرا کر وہ سکون کی تلاش میں نکلے لیکن جب ایران میں کہیں گوشۂ عافیت میسر نہ آیا تو ۱۷۳۴ء میں ہندوستان آئے اور لاہور، ملتان ہوتے ہوئے۔ دہلی پہنچے اور یہاں تقریباً ۱۴ سال رہے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہی حملہ کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی، ۱۷۴۸ء میں آگرہ آئے اور یہاں سے بنارس گئے۔ بقیہ زندگی یہیں بسر کی۔ بنارس شیخ کو بہت پسند آیا خود کہتے ہیں۔

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

۱۷۶۶ء میں انتقال کیا۔

حزیں نے نظم و نثر کی کئی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ایک نامکمل تصنیف مدت العمر ۱۷۲۳ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گئی۔ اس کے بعد فارس نامہ لکھا اور دیوان چار حصوں میں مرتب کیا۔ ۱۷۴۱ء میں اپنی سوانح تذکرۃ الاحوال کے نام سے لکھی۔ اور ۱۷۵۲ء میں ایک تذکرہ شعرا، تذکرۃ المعاصرین کے نام سے مرتب کیا۔

نثر کی عبارت دلکش اور سادہ ہے۔ تصنع نام کو نہیں۔ کہیں کہیں موزوں تشبیہات اور استعارات ہیں۔

"روزے در مجلس والد علامہ مجمعے از مستعدان منعقد بود، و مراہم در آں مجلس طلبیدند و از ہر جا سخنے درمیاں بود یکے از حاضریں ایں بیت ملا محتشم کاشی را بر خواند"

اے قامت بلند قداں در کمند تو رعنائی آفریدۂ قدِ بلند تو

"بعضے از حاضرین تحسین بلیغ نمود و والد مرحوم فرمودہ کہ دیوان ملا محتشم بہ نظر من در آمدہ۔ استاد است اما کلامش بے نمک است و آں مقدار علاوت

کہ تدارک بے نمکی کند ندارد"

دورِ آخر میں شیخ نے مذاقِ سخن کو بلند کیا۔ نثر میں سلاست غزل میں سوز و گداز، قصیدے میں فصاحت اور مثنوی میں سلاست کا اختیار کیا۔ لفاظی اور تصنع کو یک قلم موقوف کیا۔

جنوں را کار با تمکیست با مشت غبار ما	کہ بازی گاہِ طفلاں می شود خاک مزار ما
نہ برد جلوۂ گل جانب گلزار مرا	می برد نالۂ مرغانِ گرفتار مرا
حیات آنزا شمارم کز خودی لب تا دم ساقی	بجائے میفرو نتم شربت خضر و مسیحا را
تہمت آلودۂ عیشیم کہ گلشن زادیم	پر و بالے نگشودیم کہ صیاد آمد

بیدل
(۱۷۲۱ء)

میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ شاہزادہ محمد اعظم کے دربار میں ملازم ہوئے۔ ایک مرتبہ شاہزادہ نے بیدل سے اپنی شان میں قصیدہ کہنے کی فرمائش کی بیدل نے انکار کر دیا اور ملازمت چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ یہاں تعلقاتِ دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اس زمانہ کے امراء اور شرفاء بیدل کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر خود ان کے گھر پر آتے تھے۔ چند کے نام یہ ہیں۔

شکر اللہ خاں گورنر سرہند، نظام الملک آصف جاہ، امیر الامراء سید حسین علی۔ عبدالصمد گورنر لاہور۔ بیدل نے دہلی میں ۱۷۲۱ء میں انتقال کیا۔ نظم و نثر دونوں میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ طرزِ ادا نہایت الجھا ہوا ہوتا ہے۔ استعارہ در استعارہ سے اور بھی چیستاں ہو جاتا ہے۔ مضامین عمدہ اور اعلیٰ ہیں۔ لیکن جو صاف شعر نکالے ہیں۔ وہ بہت ہی عمدہ ہیں۔ ایک خدمت بیدل نے یہ کی کہ مجازی معاملہ بندی سے ہٹ کر شعر میں حقیقت کی روح داخل کی :-

بیداری میانِ دو خواب است مستیم | گرد تخیل دو سراب است ماہتیم
شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم | دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم
نہ دماغ دیدہ کشودنی نہ سرِ فسانہ شنودنی | ہمہ راز بودہ غنودنی بکنار رحمت عام او
اگر آسماں فلک طلبد ز زمین و گرم بزمیں فگند ز فلک | بقبول اطاعت حکم قضا نتواں در عذر و بہانہ زدن

غالب
۱۷۹۶ — ۱۸۶۹ء

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب افراسیاب شاہ توران کی نسل سے تھے۔ آگرہ میں ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے ابھی پانچ ہی برس کے تھے کہ اُن کے والد مرزا عبد اللہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ان کے چچا مرزا نصر اللہ نے اُن کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ لیکن چار ہی سال کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور غالب کا کوئی دنیادی سہارا نہ رہا۔ بعد میں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ اور چھ سو روپیہ سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ آخر میں واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے دربار سے پانچسو روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ان دونوں دربار وں کے ختم ہو جانے پر نواب کلب علی خاں نے اُن کو اپنا درباری شاعر مقرر کیا۔ اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی لیکن یہ وطن سے دور نہ رہ سکے۔ اور دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر سرکار انگریزی سے پنشن ملنے لگی۔ اسی پر معاش کا مدار تھا ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ ۱۴ برس کی عمر میں غالب کی ملاقات ایک نومسلم پارسی عبد الصمد نامی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ۲ برس اُن کے گھر رہا اور اُس سے فارسی کی تکمیل کی۔ اسی لئے اُن کی نظم و نثر میں ہندوستانی فارسی کا رنگ غالب نہیں۔ غالب نے خالص فارسی لکھنے اور مروج کرنے کی کوشش کی اور اسی غرض سے دستنبو حالات غدر میں ایک کتاب لکھی۔ جس میں عربی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ساری کتاب آورد معلوم ہوتی ہے۔

نظم میں البتہ غالب کو ایک خاص رتبہ حاصل ہے۔ شروع میں انھوں نے

روشِ زمانہ سے متاثر ہو کر بیدل اور ناصر علی کی تقلید کی لیکن جلد ہی حافظ اور سعدی کے کلام نے اثر کیا۔ اور اُن کی تقلید شروع کر دی۔

اصنافِ سخن میں قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی، ہر ایک پر طبع آزمائی کی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری ایک ترک (خسرو) سے شروع ہو کر ایک ترک (غالب) پر ختم ہوئی۔ قصیدہ میں سلاست اور روانی ہے۔ غزل میں برجستگی اور جوش۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔ قصیدہ:-

گفتم حدیثِ دوست بقرآں برابر است ۔۔۔ نازم بہ کفرِ خود کہ بہ ایماں برابر است

بے دستگیریم کہ ہنوز از ہوائے وصل ۔۔۔ شوریست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

با چارہ گر بگو کہ تیمار پیش کش ۔۔۔ دردیست در دلم کہ بہ درماں برابر است

غزل:-

یا رب جبین کیست کہ از بس بسجدہ سود ۔۔۔ باقی بہ ابروئے مہ کنعاں برابر است

شاہد حسن تراد در روش دلبری ۔۔۔ طرّہ پر خم صفات موئے میاں ماسوا

وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد ۔۔۔ ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

دل نہ تنہا زفراق تو فغاں ساز دبد ۔۔۔ رفتنِ عکس تو از آئینہ آوازدہد

دل چو بیند ستم از دوست نشاط آغاز د ۔۔۔ شیشہ سازیست کہ چوں بشکند آوازدہد

آرزو — سراج الدین علی خاں آرزو نسلاً شیخ کمال الدین کی اولاد میں سے تھے ۱۴ سال کی عمر میں علوم متداولہ فضلاءِ عصر سے حاصل کئے اور اعلیٰ استعداد بہم پہنچائی۔ اور شاہی منصب داروں میں شامل ہو گئے۔ شعر سے فطری ذوق تھا۔ ۱۴ سال ہی کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔

محمد فرخ سیر کے دورِ حکومت میں گوالیار میں شاہی خدمت پر مامور ہوئے بعد میں دہلی آکر رہے اور آخر وقت تک یہیں رہے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد بہت کافی ہے:-

موہبت عظمیٰ، (فن معانی) عطیہ کبریٰ (فن بیان) سراج اللغۃ، چراغ ہدایت (اصطلاحات شعرا، جدید) شرح سکندر نامہ، شرح قصائد عرفی، خیابان (شرح گلستانِ سعدی) وغیرہ

کلام میں صفائی و سلاست ہے۔ طرز ادا بے تکلف ہے۔ مضامین بھی معتدل ہیں۔

چو شبنم آبلہ پیدا بروئے آں گل شد
اگر ازناز تباں اذن تماشا گیرند
می کند ناز خط او نہ دمیدا ست ہنوز
دیدہ باشی گلِ شبنم آلود

قماش حسن بہ بینید چشم بلبل شد
از کف آئینہ گذارند دل ما گیرند
بیا باغ است کہ بنگش نرسیدا ست ہنوز
گریہ را ہم دل خوش می آید

اقبال

۱۸۷۳ء — ۱۹۳۸ء

شیخ محمد اقبال نام اور اقبال تخلص تھا۔ آپ کے آبا و اجداد کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سترہویں صدی میں مشرف باسلام ہو کر ترک وطن کیا اور سیالکوٹ کو مسکن بنایا۔ ۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ کے مدرسہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے وہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۵ء میں مشن کالج سیالکوٹ سے نمایاں کامیابی کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ اور کئی اعزاز حاصل کئے۔ یہاں تعلیم کے زیادہ مواقع حاصل نہ تھے۔ اس لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے ایم۔ اے میں نام لکھایا اور یہیں مسٹر ٹامس آرنلڈ سے ملاقات ہوئی۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اسی کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں تحصیل علم کے لئے یورپ گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ اور میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری فلسفۂ ایران پر ایک تحقیقی مقالہ کے سلسلہ میں حاصل ہوئی۔

اسی قیام یورپ میں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی اور کچھ عرصہ کے لئے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۰۸ء میں آپ یورپ سے

واپس آئے۔ اور یہاں کچھ دنوں پروفیسری کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ جس کا سلسلہ ۱۹۳۴ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد علالت کی بنا پر کنارہ کش ہو گئے۔

اقبال میدانِ سیاست کے مرد نہ تھے۔ لیکن ضروریاتِ قومی سے مجبور ہو کر ۱۹۲۶ء میں مجلسِ قانون ساز کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کی صدارت کی اور تقسیم ہند کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے لندن گئے۔ اور ۱۹۳۲ء میں تیسری کانفرنس میں شرکت کی ۱۹۲۲ء میں حکومت نے آپ کو سر کا خطاب دیا

اقبال ابتدا میں اُردو کے شاعر تھے۔ اور ۱۹۰۸ء تک صرف اردو ہی میں کہتے تھے۔ اس زمانہ میں اتفاقاً ایک دوست نے فارسی کے اشعار کی فرمائش کی آپ کو اعتراف کرنا پڑا کہ فارسی میں کبھی کچھ نہیں کہا لیکن اس وقت سے یہ بات دل کو لگ گئی اور توجہ فارسی کی طرف ہو گئی۔

اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اقبال جو پیغام دُنیا تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے اُردو کا دامن تنگ تھا۔ پھر یہ کہ فارسی کلام ہندوستان سے باہر بھی پہنچ سکتا تھا۔

اقبال غزل کے شاعر نہ تھے بلکہ مصلح قوم، اور ہادی بنی نوع انسان تھے۔ فلسفی اور حکیم تھے۔ فارسی اساتذہ میں آپ نے مولانا روم سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اور جابجا اس کا اعتراف بھی کیا۔

اقبال کے فلسفہ اور پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ "دُنیا میں صرف آزاد بندے زندہ رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ آزادی ہر انسان کا حق اور اس کا فرض ہے۔ جو انسان اپنی "خودی" کو بیدار نہیں رکھ سکتا وہ دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور خودی اگر پابند قانونِ الٰہی نہ ہو تو گمراہی ہے۔ عمل اور پیہم عمل زندگی کی دلیل ہے۔"

احتساب خویش کن از خود مرد — یک دو دم از غیر خود بیگانہ شو
تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس — اندریں کشور مقامِ خود شناس

این چمن دارد بسے شاخِ بلند　　بر نگوں شاخ آشیانے خود مبند
نغمہ داری در گلو اے بے خبر　　جنس خود بشناس و با زاغاں مپیر
خویشتن را تیز شمشیری دہ　　باز خود را در کف تقدیر دہ
اندرون تست سیلے بے پناہ　　پیش او کوہِ گراں مانند کاہ

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں بگذر　　کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست

اگرچہ اقبال کی شاعری پیامی شاعری ہے لیکن محاسن شعری سے خالی نہیں

رفعتِ خیال

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند　　کرشمہ بر دل شاں ریز و دلبرانہ گزر
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست　　کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بوداست

رقیب خام سودا مست و عاشق مست و قاصد مست

حسنِ ادا:- کہ حرفِ دلبراں دارد ادائے چندیں محمل افتادست

اگر ایں کار را کارِ نفس دانی چہ نادانی　　دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را

جوشِ بیان

من بندہ آزادم عشق است امام من　　عشق است امام من عقل است غلام من
ہنگامہ ایں محفل از گردش جام من　　ایں کوکب شام من ایں ماہِ تمام من
اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تا چند　　مرگ است دوام تو عشق است دوام من

سوز و گداز

چناں پیش حریم او کشیدم نغمۂ دردے　　کہ دادم محرماں را لذتِ سوز جدائی ہا
دریں صحرا گزار افتادشاید کاروانے را　　پس از مدت شنیدم نغمہ ہائے ساربانے را

فلسفہ

شبے زار نالید ابر بہار　　کہ ایں زندگی گریہ پیہم است
درخشید برق سبک سیر گفت　　خطا کردۂ خندہ یک دم است
ندانم بگلشن کہ برد ایں خبر　　سخن ہا میانِ گل و شبنم است

اقبال کی فارسی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے۔
اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی (مثنویاں بطرزِ مثنوی معنوی دربیانِ خودی)
پیامِ مشرق (شاعرِ المانوی گوئٹے کے دیوان سلامِ مغرب کا جواب) زبورِ عجم
(مجموعہ غزلیات) گلشنِ راز جدید (مشتمل بر پانزدہ سوالات مع جوابات)
جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مسافر و ارمغانِ حجاز میں
کچھ قطعات و رباعیات۔

(۱۰)

دورِ صفویہ

محتشم کاشی ملّا محتشم کاشی دورِ صفویہ کے صف اوّل کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ تھے اور شاہ آن پر خاص نظرِ عنایت رکھتے تھے۔

کاشی نے یوں تو قصیدہ، غزل سب کچھ کہا ہے مگر ان کا اصلی میدان مرثیہ ہے اور اسی میں دادِ سخنوری دی ہے۔

غزلوں کا رنگ پھیکا ہے۔ نہ سوز و گداز ہے اور نہ واردات قلبی کا اظہار بلوالہوسی ہے اور لفظی صناعی:۔

هزار نالهٔ جانسوز کرده ام امشب — عجب ستیزه به غمت روز کرده ام امشب
شب مرا تو سیه کردهٔ و من تا روز — دعائے بد به بد آموز کرده ام امشب
برائے خاطرِ غیرم بصد جفا کشتی — ببیں برائے کہ اے بے وفا کرا کشتی

قصائد اگرچہ غزل سے بہتر ہیں۔ مگر ان میں بھی کوئی خاص خوبی نہیں ہے البتہ تشبیہیں عمدہ ہیں:۔

دهنده که به گل نکهت و به گل جاں داد — بهر که هرچه سزا بود حکمتش آں داد
بعرش رتبه عالی به فرش پایهٔ پست — ز روئے مصلحت و رائے مصلحت داں داد

دو کشتی تما دہی اساس را در بحر — یکے رساند بہ ساحل دگر بطوفاں داد
دو سالک تنشا بہ سلوک را در عشق — یکے نوید بوصل و دگر بہ ہجراں داد

محتشم کاشی نے جو مراثی لکھے ہیں۔ ان میں تمام لوازم مرثیہ گوئی بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اور نہایت موثر ہیں۔ سننے والے کے دل پر چوٹ لگتی ہے پھر اس نے شہادت کے واقعات سے اخلاقی سبق سکھائے ہیں اور اس عالم پر اس کے اثرات بیان کرکے ایک عالمانہ شان پیدا کر دی ہے۔

بازایں چہ شورش است کہ در خلق عالم است — بازایں چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است
بازایں چہ رستخیز عظیم است کز زمیں — بے نفخ صور خاستہ تا عرش اعظم است
گویا طلوع می کند از مغرب آفتاب — کآشوب در تمامی ذرات عالم است
گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست — ایں رستخیز عام کہ نامش محرم است
در بارگاہِ قدس کہ جائے ملال نیست — سرہائے قدسیاں ہمہ برزانوئے غم است
جن و ملک بر آدمیاں نوحہ میکنند — گویا عزائے اشرف اولادِ آدم است
خورشید آسمان و زمیں نور مشرقین — پروردۂ کنارِ رسولِ خدا حسینؑ

سحابی | سحابی استرآبادی جرجانی الاصل تھے۔ شوستر میں پیدا ہوئے۔ شاہ عباس کے دربار کے متوسل تھے۔

دورِ صفویہ فارسی ادب و شعر کے لئے انتہائی انحطاط کا زمانہ گزرا ہے لیکن سحابی ان چند افراد میں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنے ادبی کارناموں سے اس دور کا نام زندہ رکھا۔

خیام کے بعد یہ دوسرے رباعی گو شاعر ہیں۔ سترہ ہزار رباعیات لکھی ہیں۔ اور ان میں خیام کی طرح زیادہ حصہ خمریات کا نہیں۔ بلکہ مسائل تصوف کا بیان ہے۔ مسائل اخلاق اور تعلیم اخلاق حسنہ۔ سحابی سے بہتر رباعیات میں کہیں نہیں مل سکتی۔

مسئلہ جبر و اختیار کو خیام نے بھی لکھا ہے۔ مگر وہ جبر کا قائل ہے

سحابی کا نظریہ دیکھیے۔

عالم بخروش لا اِلٰہ اِلا ہو ست — غافل بگماں کہ دشمن است اویا دوست

دریا بوجود خویش موجے دارد — خس پندارد کہ این کشاکش با اوست

خود اپنے وجود کو اس قدر محترم خیال کرتا ہے کہ اسی کو طالب اور مطلوب سمجھتا ہے :-

آنم کہ ندارم بدو عالم کامے — نا یافتہ جز بیک وجود آرامے

گر خلق جہاں جملہ چو من بودندے — لازم نشدے رسولے و پیغامے

جو اپنے وجود کو مکمل طور پر محبوب حقیقی کے سپرد کر چکا وہ ہر فکر سے آزاد ہے۔

گم کردم اگر تو جستجو یم نکنی — آئینہ صفت روے بہ رویم نکنی

در حق خود از لطف تو گفتم بسیار — یا رب، یا رب، دروغ گویم نکنی

طاہر وحید ۱۷۰۹ء محمد طاہر وحید قصبہ قزوین کے رہنے والے تھے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کر کے مرزا تقی الدین محمدؒ اور خلیفہ سلطان کے معتمد کی حیثیت سے ملازم رہے۔ یہ دونوں شاہ عباس ثانی کے وزراء تھے۔ آخر میں سلطان نے اپنے زمانہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا سنہ ۱۶۹۰ء میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوا اور ۱۸ برس یہ خدمت انجام دے کر سنہ ۱۷۰۹ء میں انتقال کیا۔

نظم میں طاہر کا ایک دیوان جس میں قصائد، غزل، قطعات وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ اس کی یادگار ہے۔ لیکن اس کی شاعری کا کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے۔ صاحب آتشکدہ کی رائے ہے کہ "اس کی شاعری بے کیف ہے اور محض اس لئے پسند کی جاتی ہے کہ وہ ایک بلند مرتبہ کا شخص ہے۔"

لیکن نثر میں اس کی کتاب انشائے طاہر وحید اس زمانہ کی مستند کتاب ہے اس کتاب میں وہ خطوط ہیں جو اس نے وزیر کی حیثیت سے دوسرے سلاطین اور امرا کو شاہ ایران کی طرف سے لکھے۔ ان خطوط کی زبان نہایت

بلند، عبارت مشکل اور مرصع، اور شروع سے آخر تک لفظی صناعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ البتہ نکاتِ سیاست اور اس زمانہ کی خارجی پالیسی کا اندازہ اُن سے ہو جاتا ہے

اسکندر منشی منشی اسکندر نے تاریخ عالم آرائے عباسی لکھی۔ اس میں شاہانِ صفویہ کا حال شاہ عباس اعظم تک نہایت تفصیل اور ترتیب سے لکھا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ یہ تاریخ نہایت معتبر ہے اور اکثر تحقیقات تاریخی کا ماخذ ہے۔ عبارت تمام تر الجھی ہوئی نہیں ہے۔ کہیں کہیں صاف سلیس فقرے بھی ہیں۔ استعارات بھی اگرچہ بہت کثرت سے ہیں لیکن اکثر بعید از قیاس نہیں۔ ترکی الفاظ ضرورت سے زیادہ اس کتاب میں شامل ہیں۔ اور انھوں نے عبارت کو زیادہ غیر مانوس بنا دیا ہے۔

عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔ بادشاہ کی سواری کا ذکر ہے:۔

"اشہب صبا پوید بعزم سیر و شکار سواحل رود ہیرمند و انتظام مہات ضروری خراسان بہ انصوب انعطاف داده"

آذر لطف علی بیگ آذر شاملو خاندان کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ کریم خاں زند کی مدح سرائی کرتے تھے۔ نادر شاہی حملوں کے زمانہ میں آوارہ وطن ہوئے اور اسی زمانہ میں حج کے فرض سے سبکدوشی حاصل کی۔ فن شعر میں میر مشتاق علی کے شاگرد تھے۔ نظم میں دیوان غزلیات و قصائد اور ایک مثنوی یوسف زلیخا اور نثر میں ایک تذکرہ شعرائے فارسی آتشکدہ یادگار ہے۔

تذکرہ کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔ کہیں الجھاؤ یا رنگینی نہیں۔ شعراء اور خصوصاً ہم عصر شعراء کے حالات کافی تحقیق کے ساتھ لکھے ہیں۔ لیکن یہ عام طور پر مسلم ہے کہ انتخاب اچھا نہیں ہے۔ اگر صرف آتشکدہ کے انتخابات کو دیکھا جائے تو شاعر کی صحیح عظمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ایک وقت یہ ہے کہ آذر کا جوش حب وطن ان کو ان شعراء کی تعریف کرنے سے روکتا ہے۔ جو ایران چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے اُن کے حالات اور کلام سب کچھ مسخ شدہ ہے۔

(۱۱)

دورِ قاچاریہ

صبا کاشانی فتح علی خاں نام اور صبا تخلص تھا۔ کاشان کے رہنے والے تھے۔

فتح علی شاہ کے زمانہ میں ملک الشعرا رہے۔ اور ان کی شان میں بہت سے قصائد ان کی یادگار ہیں۔ قصائد کی زبان اور طرزِ ادا میں کوئی خاص جدت یا لطف نہ تھا۔ بلکہ رعایات لفظی ومعنوی کی کثرت ہے اور اسکی وجہ سے کلام میں روانی اور سلاست باقی نہیں رہی۔ پھر بھی کہیں کہیں کلام میں جو زور دکھائی دیتا ہے۔ وہ آنکی استادی کی دلیل ہے۔ علاوہ شاہ کی مدح کے توحید یہ قصائد بھی لکھے ہیں۔ ایک قصیدے کے ابتدائی چند شعر دیکھیے:۔

تعالی اللہ خداوندِ جہاندارِ جہاں آرا | کزو شد آشکارا گل زخارہ، گوہر از خارا
مرصع کرد برچرخ زبرجد گوہرا نجم | معلق کرد برخاک سطبق گنبد مینا
زز لفش شاہد شام آمدہ باطرۂ تیرہ | زفیضش با لوئے بام آمدہ باغرۂ غرّا
نشاندہ باغبانِ قدرتش در روضۂ ہستی | ہزاراں سرو مہ منظر ہزاراں ماہ سرو آسا

دو مثنویاں شہنشاہ نامہ اور خداوند نامہ لکھی ہیں۔

مثنوی خداوند نامہ کا لب ولہجہ اور زورِ بیان بالکل فردوسی کا سا ہے اور کمال یہ ہے کہ محاسنِ شعر کو برقرار رکھتے ہوئے واقعات کو صحیح طور پر بیان کیا ہے:۔

حضرت علیؓ رسول مقبولؐ سے اجازتِ جہاد طلب کرتے ہیں۔

کہ شیر خدا یال یازید چست | کہ شاہا منم آنکہ بسرود وجست

پیمبر نبردوش کہ عمرو است ایں | کہ دستِ علی آختہ ز آستیں
علی گفت کاسے شاہ اینک منم | کہ یک بیشہ شیراست در جوشنم
بہ دو آفریں خواند و خواندش بہر | کہ یارتو دادار گردان سپہر
بسر بست دستار از پاک دست | کشادو دو گیتی نہانش ببست

قاآنی

۱۸۰۸ء ـ ۱۸۵۲ء

مرزا حبیب اللہ نام اور قاآنی تخلص تھا۔ مرزا ابوالحسن گلشن قاآنی کے والد شیراز کے رہنے والے تھے قاآنی وہیں ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ مشہد حصول تعلیم کے لئے گیا۔ اور بڑی محنت سے علوم درسیہ کی تکمیل کی۔

کم عمری ہی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ اور بہت جلد اس کے اشعار نے مقبولیت کی سند حاصل کر لی۔

قاآنی شروع میں حبیب تخلص کرتا تھا۔ لیکن جب شجاع السلطنت حسین علی مرزا کی ملازمت کی تو اس کی خواہش پر قاآن کی نسبت سے قاآنی تخلص اختیار کیا۔

شہزادہ شجاع السلطنت نے قاآنی کو اپنے والد فتح علی شاہ کے دربار میں پیش کیا۔ جہاں اس کی بڑی قدر ہوئی اور بہت جلد مجتہد الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد محمد شاہ وارث تخت ہوا۔ اور اس نے قاآنی کو حسان العجم کا خطاب عطا کیا۔ ۱۸۴۸ء میں ناصر الدین شاہ قاچار تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی قاآنی کی بڑی قدر کی اور ملک الشعرائی کے مرتبہ پر فائز کیا۔ ۱۸۴۹ء میں قاآنی نے ایک فرانسیسی سے فرانسیسی زبان کی حاصل کی اور بہت جلد نہایت صحیح فرانسیسی بولنے لگا۔

قاآنی کا انتقال طہران میں ۱۸۵۳ء میں ہوا۔

یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ قاآنی نے فرانسیسی زبان حاصل کر لی تھی اور مغربی ادب سے واقف ہو گیا تھا۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ عربی اور ترکی میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ پھر تمام علوم سے بھی واقف تھا۔ شعرگوئی

میں اُس نے اپنی اس لیاقت سے وہ کام لیا ہے کہ شاعری میں آج اُس کا جواب نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس کے پیشِ نظر قدما، متوسطین اور مغربی شعراء کا کلام تھا۔ اور اس نے اپنی ذہانت کو کام میں لا کر اُن کے یہاں سے جو کار آمد اور عمدہ باتیں تھی سب حاصل کر لیں۔ قدما کی سلاست اور روانی متوسطین کی نازک خیالی اور استعارہ آفرینی، صنائع و بدائع کی چاشنی اور مغربی شعرا کی فطرت نگاری اور مضمون آفرینی سب بیک وقت اس کے یہاں موجود ہے۔ پختگی اور استواری سے ان محاسن پر جلا کر کے دو بالے بہار بنا دیا ہے۔ عربی آمیز فارسی لکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی زبان و بیان میں اتنی صفائی اور سلاست ہے کہ سعدی کا دھوکا ہوتا ہے۔ جہاں معنویت کا تعلق ہے۔ مضامین اخلاق و تصوف بھی بیان کئے ہیں۔

مناظرِ قدرت

گردوں تیرہ ابرے بامداداں برشد از دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

چو چشم اہرمن خیزہ چو روئے زنگیاں تیرہ
شدہ گفتی ہمہ چیرہ بمغز ش علت سودا

تنش با قیر آلودہ دلش از شیر آمودہ
دروں سو سرمہ سودہ بروں سو لولوے لالا

تشبیہات

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جوئبار ہا | و یا گسستہ حور عین ز زلف خویش تار ہا
ز سنگ اگر ندیدہ چساں جہد شرار ہا | ببرگہائے لالہ بیں میانِ لالہ زار ہا

کہ چوں شرارہ می جہد ز سنگِ کوہسار ہا

عاشق کی دنیا محبوب ہے:۔

کشودی زلف قیر آگیں جہاں را قیرداں کردی
نمودی چہر مہر آئیں زمیں را آسماں کردی

عشق کے تدریجی منازل

نگارا - دلبرا - یارا - دلارا ما دفادارا
تجلی زین نا جا بادی کہ مارا بے نشاں کردی

سوال وجواب:- بارد چہ؟ خون، کہ؟ دیدہ چساں؟ روز وشب چرا؟
از غم - کدام غم؟ غم سلطان کربلا
نامش چہ بد؟ حسینؑ - ز نژاد کہ؟ از علی
امش کہ بود؟ فاطمہؓ - جدش کہ؟ مصطفیٰؐ

یغمائے جندقی

میرزا ابوالحسن نام اور جندق وطن تھا۔ قصبہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ عراق میں ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔ ذوالفقار علی خاں کا منشی تھا۔ اس کے خطوط کا ایک مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اُنکی زبان خالص فارسی ہے۔ نئی نئی ترکیبیں، ظرافت شوخی اور جدت پھر زبان کی سلاست اور صفائی نے مل کر ایک نہایت دلفریب فارسی نثر پیدا کر دی ہے۔ ظرافت اور شوخی کو کبھی متانت پر غالب نہیں ہونے دیا۔ اس کے ایک خط کی عبارت ذیل میں بطور نمونہ درج کیجاتی ہے

"گروہے گوناگوں، ہر یک براہ و رنگے دیگر، دریں انجمن، جائے وبارے دارند وبہ آئین و آہنگے بہتر یا بدتر گفت وگذارے گرم وسرد میلا نیدوریختہ وخام میسرانید۔ وے آنکہ گوش دار دکیست؟ یا دیدۂ سگ را از سروانی سرورش باز داند کدام؟

شاعر بھی تھا۔ ذوالفقار علی کی صحبت میں ہزلیات کی عادت پڑ گئی تھی۔ اور اتنی لکھیں کہ ایک مجموعہ سرداریہ کے نام سے تیار ہو گیا۔ غزل بھی کہتا تھا۔

ذیل کے اشعار سے اس کے رنگ کا اندازہ ہو جائے گا۔

زلف در پائے تو بیم است کہ دیوانہ شوم — آہ بینم اگر ایں سلسلہ بر پائے دگر
ما خراب از غم و منجا نہ زمے آباد است — ناصح از بادہ سخن کن کہ نصیحت باد است

سپہر کاشانی مرزا محمد تقی نام اور سپہر تخلص تھا۔ کاشان کا رہنے والا تھا۔ فتح علی شاہ اور محمد شاہ کے دربار میں نغمہ سنجی کرتا تھا۔ عالم تھا اور نظم و نثر دونوں پر عبور حاصل تھا۔ بارگاہِ سلطانی سے لسان الملک کا خطاب ملا۔

نثر میں ایک تاریخ ناسخ التواریخ کے نام سے لکھی۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں حضرت آدمؑ سے لیکر امام زین العابدینؑ تک کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ دوسرے حصہ میں شاہانِ قاچار کی تاریخ ہے۔ کتاب کی زبان نہایت صاف اور شیریں ہے۔ طرز ادا بھی دلکش اور تصنعات سے پاک ہے اس کے علاوہ ایک کتاب فن شعر پر براہین العجم اور ایک تذکرہ شعراء و علماء بھی اس کی تصنیف ہے۔

نظم میں علاوہ قصائد کے ایک مثنوی اسرار الانوار حضرات چہاردہ معصومینؑ کی مدح میں لکھی۔ اس کی زبان بھی صاف ہے طرز ادا سے ارادت و محبت ٹپکتی ہے۔

ذیل میں اس کے ایک قصیدہ کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں جس سے اس کے طرزِ کلام کا اندازہ ہو گا۔

ساقی برخ گلبرگ تر، عکس رخش در جام زر — چوں پور آذر ناگذر، از آزر گلستاں پرورد

ہم راو نی بے جادہ کن ہم بید برگ آمادہ کن — با خویش کار بادہ کن زاں مہ کہ کتاں پرورد

از طرۂ صد خم کیں زرہ، افشاندہ بر سیم سرہ — و اندر شکنج ہر گرہ کفر سیت کایماں پرورد

رویش چو آتش پر بہا۔ در آتشش آب تبا — یا عدل شہ آں آب را در نار سوزاں پرورد

ہدایت رضا قلی خاں بن محمد ہادی نام۔ طبرستان کے رہنے والے تھے۔ علوم مروجہ کی تکمیل کے بعد دربار میں رسائی حاصل کی۔ شہزادہ شجاع السلطنۃ خاص قدر دانوں میں تھا۔ فتح علی خاں نے خاں کا خطاب دیا۔ اور ملک الشعراء صبا شیرازی کے بعد ملک الشعراء کے منصب پر فائز ہوئے ناصر الدین شاہ قاچار

کے عہد میں مدرسہ دار الفنون کے صدر مقرر ہوئے۔

نثر میں علاوہ فہرس التواریخ ریاض العارفین اور لطائف المعارف کے بادشاہ کے حکم سے روضۃ الصفا میں صفویہ سے قاچاریہ تک کا حال اضافہ کیا ایک تذکرۃ الشعراء، مجمع الفصحا کے نام سے تحریر کیا۔ نثر کی زبان سلیس اور دلکش ہے۔ طرز موثر خانہ ہے۔

نظم میں انوار الولایہ، گلستان ارم، بحر الحقایق، انیس العاشقین، خرم بہشت اور ہدایت نامہ مثنویان اور ایک دیوان مشتمل بر قصاید و غزلیات یادگار چھوڑا۔

کلام میں سادگی ہے۔ اور بناوٹ سے پاک ہے۔ ایک خوبی یہ ہے کہ مشکل ردیفوں میں سلاست پیدا کی ہے:۔

سرو من بر لالہ از سنبل نقاب آردہمی	آفتابے را نہاں زیر سحاب آردہمی
آہوئے مردم شکارش خون مردم بسکہ خورد	لالۂ عنبر نقابش مشکناب آردہمی
گر سیاوش نیست آں خط سیہ وش ایں قدر	از چہ رو در رفتن آتش شتاب آردہمی

اشعار از گلستان ارم:۔

بنام آنکہ بے نامش بہ نامہ	نمی گردد رواں از عجز نامہ
ہمہ عالم بخودش گشتہ پیدا	دلے خود لے نہان و نے ہویدا
بہر ذرہ ز نور آفتابش	ظہوری و ظہورش خود حجابش
ہمہ کارے عجائب در عجائب	بہر جا حاضر و از جملہ غایب

ناصر الدین شاہ قاچار

شاہ نے یورپ اور امریکہ کی سیاحت کی اور اس کا حال ایک مفصل سفر نامہ میں لکھا جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ دوسرے محاسن کے سفر نامہ کی زبان سہل ممتنع ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ کثرت سے شامل کئے ہیں۔ بعض معرب کر کے اور بعض بجنسہٖ جس کی بدولت یہ کتاب فارسی جدید کا ایک بے بہا خزانہ بن گئی ہے فارسی میں جس قدر غیر زبانوں کے الفاظ آج پائے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدا اسی

سفرنامہ سے ہوئی اور اس اعتبار سے نہ صرف یہ کتاب ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے بلکہ شاہ موصوف کا شمار زبان کے مقتدر محسنین میں ہوتا ہے۔ علاوہ ناموں کے علمی اور فنی اصلاحات کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایران میں تحقیقات کا دروازہ کھلا۔ سفرنامہ کا نمونہ یہ ہے۔

"دیشب کہ دریا را تماشا کردیم بعضے ماہیہائے ریزہ دیدیم مثل حیوانات کوچک فسفر دار کہ در مازندران ایران لیسیا است و در شب دُم شان برق می زند این ماہیہا ہم توسے دریا از زیر موج وکف آب کہ از زیر چرخ کشتی بیرون آمد زیر و بالا میشدند و مثل الکتریسیتہ در تاریکی شب برق می زدند۔ خیلے تماشا داشت، ہنوز نرسیدہ مقابل رودخانہ ٹمس سہ کشتی زرہ پوش انگلیس باستقبال ما آمدہ بنا کردند بہ شلیک توپ نمودن و سلام دادن۔ کشتیہائے بخاری و بادبانی زیاد ہم کہ ہمہ پر از مرد و زن بود از انگلیس برائے تماشا آمدہ بودند متصل ہورا میکشیدند و دستمال تکان می دادند"

شاہ غزل بھی کہتے تھے۔ مجاز کا رنگ ہے:۔

تکلم چوں نماید معجز عیسیٰ شود ظاہر   تبسم چوں نماید خوشہ پروین شود پیدا
بفردائے قیامت کے زجا فریاد بر خیزد   مگر وقتیکہ در چشمش رخ شیریں شود پیدا

---

(۱۲)

دورِ جدید

بہار خراسانی ۱۸۸۶ء

مرزا محمد تقی بہار ملک الشعراء صبوری کے خلف ارشد ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں بمقام مشہد پیدا ہوئے اور وہیں علمائے عصر سے عربی اور فارسی کی تکمیل کی۔ ۱۹۰۴ء میں

والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُس وقت آپ نے ادیب نیشاپوری اور میرزا
عبدالرحمن کی شاگردی اختیار کی۔ کچھ عرصہ کے بعد آصف الدولہ غلام رضا خاں
گورنر خراسان کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور انہی کی سفارش سے مظفرالدین
شاہ قاچار نے ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا۔ اور سالانہ وظیفہ مقرر کرکے
فکر معاش سے آزاد کر دیا۔

۱۹۰۶ء میں ایران میں انقلاب ہوا اور بہار خراسانی نے ایک پُرجوش
وطنی کی حیثیت سے اس میں شرکت کی اور ۱۹۰۹ء تک برابر علمی اور قلمی خدمت
کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے حبل المتین (کلکتہ) اور دوسرے اخبارات
میں اپنی قومی نظمیں شائع کرائیں۔ جن سے ملک میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔
اور آپ ملک کے محبوب شاعر بن گئے۔

۱۹۱۱ء میں مشہد سے نو بہار نامی روزنامہ جاری کیا۔ قومی خدمات
کے سلسلہ میں آپ کو سخت تکالیف اُٹھانا پڑیں۔ دو بار جلا وطن کئے گئے۔
دو دفعہ حکومت کے حکم سے اخبار بند کیا گیا۔ لیکن آپ کے پائے استقلال
کو جنبش نہ ہوئی۔

۱۹۱۲ء میں قوم پرستوں نے حکومت کے مظالم سے تنگ آکر طہران
سے بغداد، قسطنطنیہ، اور کرمانشاہ کی جانب ہجرت کی تو بہار بھی مہاجرین
میں شامل تھے۔ اس ہجرت سے واپسی کے بعد آپ نے نو بہار دوبارہ طہران
سے جاری کیا۔ کچھ عرصہ تک مجلس شعرائے ملی کے ممبر بھی رہے۔ اب
سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔

نو بہار کے علاوہ کچھ مدت دانش کدہ اور ایران کی ادارت بھی کی ہے
آپ کی نثر کی تصانیف و تالیف میں نیرنگ سیاہ و یا کنیزان سفید (ایک مختصر ناول)
اور تاریخ سیستان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بہار کی نثر کی تصانیف کی زبان نہایت رواں اور شیریں ہے۔ تاریخ
سیستان ایک نہایت معتبر کتاب ہے۔ جس میں سیستان کی تاریخ اور

معاشرتی حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیۓ گۓ ہیں۔ بحیثیت شاعر کے بہار نے قومی نظمیں لکھیں۔ جن میں جذبۂ حریت، قربانی اور مطالبۂ آزادی کارفرما نظر آتا ہے۔ جوش اور روانی ہر ہر لفظ سے ٹپکتی ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ و اخلاق بھی بیان کیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

افکار اخلاقی و فلسفی

روح من گر زنیاگان من است — العجب پس من بہ بخت کہ ام
دگر این روح دفرزندان من است — بستۂ بند در اشت چہ ام

تغزل

اگر تو مرغ بہ کشائی ستم نخواہد شد — زحسن و خوبی تو ہیچ کم نخواہد شد
تو پاک باش و بہ دوں آۓ بیجاب مترس — کسے بصید غزال حرم نخواہد شد

عارف قزوینی
۱۸۸۲ء

میرزا ابوالقاسم عارف ۱۸۸۲ء میں قزوین میں پیدا ہوۓ۔ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ہی موسیقی اور خطاطی میں بھی مہارت پیدا کی۔ تھوڑے عرصہ روضہ خوانی بھی کی۔ طبیعت ازل سے شاعرانہ لے کر آئے تھے۔ ۱۷ سال کی عمر میں خانم بالا ایک حسینہ سے محبت ہو گئی۔ اور اس سے تمام خاندان کی مرضی کے خلاف شادی کی اور چند ہی سال کے بعد مجبور ہو کر طلاق دی مگر پھر دونوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ ۱۸۹۰ء میں رشت گۓ۔ اور ایک سال بعد طہران آکر امیر موثق الدولہ کی مصاحبت میں داخل ہو گئے اور شاہ مظفر الدین کے دربار میں بھی رسائی حاصل کر لی۔ لیکن یہ سب کچھ ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ طوعاً و کرہاً زندگی گزارتے رہے۔ جس وقت تحریک آزادی شروع ہوئی تو عارف پورے جوش کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔ اور جب احرار نے ایران سے ہجرت کی تو عارف قسطنطنیہ چلے گئے۔

عارف نے عوام میں آزادی کی روح پھونکنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ آپ گاؤں گاؤں اپنی غزلیں گاتے پھرتے تھے۔ اور امرا اور عمالِ سلطنت کے مظالم بیان کرتے تھے۔ میرزا احمد خاں قوام السلطنت نے اسی سبب سے ان کو بند کرادیا تھا۔

عارف ماہر موسیقی تھے اور انھوں نے نئی نئی بحریں اور اوزان ایجاد کئے ہیں۔ آپ نے غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ آپ کا دیوان ۱۹۱۳ء میں شائع ہوچکا ہے۔ جس پر ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے مقدمہ لکھا ہے۔

آپ کے اشعار لطیف جذباتِ قومی سے لبریز ہیں۔ اور سننے والا کیف سے جھومتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

داد حسنت بتو تعلیم خود آرائی را ــــ زیب اندام تو کرد این ہم زیبائی را
قدرتِ عشق تو گرفت بسر نیزۂ حسن ــــ طرفۃ العین زمن قوۂ بینائی را
ہم گر فتنۂ چشم تو بجوا باندبارز ــــ در تماشائے تو آشوب تماشائی را
اے بتِ شرق مبنہ پا بازدیا تاپائے ــــ بزمین خشگدبت ہائے اردپائی را

جعفر قراجہ داغی

۱۸۳۲ ــــ ۱۸۸۶

مرزا جعفر قراجہ داغی ۱۸۳۲ء میں قراجہ داغ میں پیدا ہوئے۔ شہزادہ جلال الدین مرزا نے بڑی قدر و منزلت کی۔ مرزا جعفر کے ایک لڑکی تھی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ ایران کا طریقۂ تعلیم بے حد ناقص تھا۔ اس لئے وہ اپنی لڑکی کے لئے ایک سلسلۂ کتب تیار کرنا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے شہزادہ کے کتب خانہ میں ترکی ڈرامے مرزا فتح علی کے لکھے ہوئے دیکھے اور ان کے طرز کو بے حد پسند کیا۔ اور بچوں کے لئے سہل فارسی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا سب سے پہلے اس نے ملا ابراہیم کیمیاگر کا ترجمہ کیا اور ۱۸۶۲ء میں شہزادہ کی نذر کیا۔ اسی سال دوسرا ترجمہ حکیم نباتات کے نام سے مکمل کیا۔ افسوس کہ یہ ڈرامے شہزادہ کی زندگی میں طبع نہ ہوسکے۔ ۱۸۷۳ء میں خرس قلدرسین اور یوسف شاہ اور ۱۸۸۱ء میں وزیر لنکران، مرد خسیس اور وکلائے مرافعہ کا ترجمہ

کیا۔ اور ان سب کو یکجا طور پر طبع کرا کے مصنف کی خدمت میں بھیجا۔ یہ سب ڈرامے اس خوبی کے ساتھ ترجمہ کئے گئے ہیں کہ یہ اندازہ مشکل سے ہو سکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے یا تصنیف۔ نہایت سلیس اور سادہ زبان ہے۔ اور اصل ڈرامہ کی تمام خوبیاں برقرار رکھی ہیں۔ ان ڈراموں میں ایرانی حکومت کے نقائص نہایت خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ قراجہ داغی کا مرتبہ بحیثیت نثر نگار کے اس لئے اور بلند ہو جاتا ہے۔ کہ اس نے ڈرامہ کی صنف کو فارسی زبان میں داخل کیا۔ ورنہ اس سے قبل صرف واقعات کربلا ڈرامہ کی شکل میں لکھے جاتے تھے اور وہ فنی اعتبار سے کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔

دہخدا ۱۸۸۰ء میرزا اکبر خاں نام اور دہخدا تخلص ہے۔ ان کے والد قزوین سے ترک وطن کر کے طہران آگئے تھے۔ اور دہخدا ۱۸۸۰ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اور تمام املاک وجائداد تلف ہو گئی۔ مگر آپ کی لائق والدہ نے مصائب اٹھا کر بچوں کو تعلیم دلائی آپ کی ابتدائی تعلیم شیخ غلام حسین جیسے فاضل عصر کی سرپرستی میں ہوئی۔ آپ نے دہخدا کی ذہانت اور لیاقت دیکھ کر نہایت توجہ سے علوم رسمی کی تکمیل کرائی۔ اس کے بعد طہران کے مدرسہ سیاسی میں داخل ہو گئے۔ زمانہ طالب علمی میں آپ معاون الدولہ سفیر ایران کے ساتھ یورپ گئے۔ اور وہاں دو سال قیام کیا۔

تحریک آزادی کے شروع ہوتے ہی آپ پوری سرگرمی کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔ صور اسرافیل کی ادارت کی احرار کے ساتھ ترک وطن کر کے اول پیرس اور پھر قسطنطنیہ گئے۔ اور یہاں سے سروش نامی اخبار جاری کیا۔ جمہوریت کے قیام کے بعد وطن واپس آئے اور مجلس ملی کے رکن منتخب ہوئے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں آپ کی سرگرمیاں کم ہو گئیں۔

آغز میں مدرسہ سیاسی طہران کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے۔ آپ کی تصانیف میں حکم و امثال فارسی (چار جلدوں میں) دو ترجمے عظمت و انحطاط رومیان، اور روح القوانین اور دو لغات ایک فارسی سے فرانسیسی میں اور ایک خود فارسی کا قابلِ ذکر ہیں۔

اگرچہ آپ کی شاعری عہدِ جوانی کی یادگار ہے۔ پھر بھی معنویت اور جوش کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہے۔

اشعارِ حکمتی:۔ دربوکم گفت پنہاں عارف وارستہ اے
نقد سالک نیست جز تیمار قلب خستہ اے
در گلستانِ جہاں گفتم چہ باشد سود گفت
در بہارِ عمر از ازہار حقایق دستہ اے
دل مکن بد پاکی دامانِ عفت را چہ باک
گر بشنعت ناسزائے گفت ناشایستہ اے

ادیب الممالک
۱۸۶۱ — ۱۹۱۷ء

آپ کا نام مرزا صادق خاں تھا۔ لیکن عام طور پر ادیب الممالک کے لقب سے مشہور ہیں ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ شروع میں پروانہ تخلص کرتے تھے۔ لیکن جب ۱۸۹۰ء میں امیر نظام تبریزی کی ملازمت کی تو اس نسبت سے امیری تخلص اختیار کیا۔ ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۶ء تک حکومت کے دار الترجمہ طہران میں بحیثیت مترجم کے کام کیا۔ ۱۸۹۹ء میں لقمانیہ کالج تبریز میں ملازمت پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد تبریز سے ادب نامی اخبار جاری کیا۔ ۱۹۰۵ء تک روزنامہ ایرانی سلطانی کے لکھنے کی خدمت پر مامور رہے۔ ۱۹۰۶ء میں اخبار ارشاد کے ادارے میں داخل ہوگئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مجلس میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۰۹ء میں عراقِ عجم کے نام سے ایک دوسرا اخبار جاری کیا۔ اس کے بعد عدالتِ عالیہ کے صدر کی حیثیت سے اول ۱۹۱۱ء میں عراق میں اور ۱۹۱۷ء میں یزد میں کام کیا۔ اور اسی سال انتقال کر گئے۔

آپ کی نظموں سے جذباتِ حریت و وطنیت مترشح ہیں۔ چونکہ ترنم اور جوش خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لئے مقبول عام ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے طنزیہ مضامین جو مختلف اخباروں میں شائع ہوئے خاص طور پر پسند کئے گئے۔

رضازادہ شفق آقائے رضازادہ شفق تبریز میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں عربی، فارسی، اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور مدیر مدرسہ حیات مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد روزنامہ شفق تبریز کے مدیر ہوئے۔ رابرٹ کالج استنبول میں ثانوی تعلیم حاصل کی۔ اور کچھ عرصہ تک وہیں مدارس میں معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہاں سے ایران واپس آئے۔ اور اور کچھ عرصہ رہ کر برلن گئے۔ اور وہاں سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لائے۔

یہیں آپ نے المانی، فرانسیسی، انگریزی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ مراجعت کے بعد دانش سرائے عالی طہران میں فلسفہ و ادبیات اور جرمنی، زبان کی تعلیم دیتے رہے۔

آپ کی تصانیف میں تاریخ ادبیات ایران، راہ رہائی، مجموعۂ اقتصاد و ترجمہ تاریخ مختصر ایران مطبوعہ ہیں۔ شاعری شفق محض تفنن طبع کے لئے کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی نظمیں رسائی ذہن، جودتِ طبع اور حسِ قلبی کی آئینہ دار ہیں۔ آپ کو مرثیہ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ اپنے بھائی اور والد کی وفات پر دو مرثیے لکھے ہیں۔ جو بہمہ وجوہ مکمل ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے

گو ناصح مدہ پندے گذشت از کار کارِ من
حدیث عشق کوتہ کن کہ رفت از دست یارِ من

بروز بیکسی ہمسایہ من سایۂ من بود
دلے آنہم ندارد طاقت شبہائے تارِ من

خود گوید توانا مرد باید زندہ دل گردد
دریغا دل ربود از من عنانِ اختیار من

پور داؤد
۱۸۸۶ء

مرزا ابراہیم خاں نام ہے، رشت کے مشہور تاجروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں رشت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ طہران گئے وہاں سے طب یونانی کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد بغداد اور بیروت گئے۔ وہاں سے ۱۹۱۰ء میں پیرس پہنچے۔ اور یونیورسٹی میں داخلہ کرا کے قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ لیکن لڑائی شروع ہونے کی وجہ سے بدقت تمام کرمان شاہ پہنچے اور یہاں سے رستیخز نامی اخبار جاری کیا۔ ۱۹۱۶ء میں ایک بار پھر برلن گئے اور وہاں سے ۱۸ برس کے بعد ۱۹۳۴ء میں واپس آئے۔

پور داؤد انتہا پسند وطن پرست ہیں جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے آپ چاہتے ہیں کہ ایرانی زبان میں کوئی لفظ عربی کا باقی نہ رہے۔ اسی طرح ترقی کے سلسلہ میں بھی آپ قدیم ایرانی روایات کو زندہ کرنے کے سخت حامی ہیں۔ چنانچہ پیرس کے قیام کے زمانہ میں آپ نے وہاں ایک انجمن ایران قائم کی تھی۔ اور برلن کے طویل قیام میں بھی برابر ایرانی مفاد کے لئے کام کرتے رہے۔ ایرانی انقلاب کے متعلق بھی آن کی بہت سی نظمیں ہیں۔

رشت میں کچھ قیام کے بعد آپ نے بمبئی اور برلن کا ایک اور سفر کیا اور اس کے بعد شانتی نکیتن میں آکر مقیم ہو گئے۔ اور یہیں درس و تدریس میں مشغول ہیں۔

آپ نے اوستا کے مختلف حصوں کا ترجمہ کیا اور ان پر نہایت محققانہ تفسیر لکھی۔ ان میں خوردہ اوستا، یشت، اور گاتھا کے ترجمے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا دیوان پوراندخت نامہ بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی نظموں میں متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ پڑھنے سے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بلند مرتبہ بزرگ، نہایت شیریں الفاظ میں نصیحت کر رہا ہے۔ کہیں کہیں نوجوان مخاطب کو گرمانے کے لئے گفتگو میں جوش بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

تکیہ بر زندگانی روا نیست چرخ را رسم مہر و وفا نیست
چون حبابے نشستہ بر آبیم اعتمادے بر دور فنا نیست
کاروانے ز ما رفتہ از پیش تک نشانے ازاں دوسرا نیست

تا چند زباں ز ظلم بستہ ز آزادی خویش دست شستہ
نومید بگوشہ اے نشستہ گر چشم نہ کور و پائے لنگ است
برخیز ز خواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است

ایرج مرزا
۱۸۷۴ — ۱۹۲۵ء

جلال الممالک شاہزادہ ایرج مرزا فتح علی شاہ قاچار کے پوتے تھے۔ ۱۸۷۴ء میں تبریز میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں فارسی، عربی، اور فرانسیسی زبانوں میں مہارت حاصل کی مظفرالدین شاہ قاچار کی تخت نشینی کے بعد حکومت کے متعدد اہم مناصب پر سرفراز ہوئے۔ اور پھر جمہوریت کے قیام کے بعد بھی وزارت مال، وزارت داخلہ، اور وزارت معارف کے اہم اور ممتاز عہدوں پر مامور ہوئے۔ اور فرائض منصبی کو نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ ۱۹۲۵ء میں بمقام طہران اچانک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔

ایرج مرزا نہایت ذہین، فہیم اور ذکی انسان تھے۔ باوجودیکہ آپ کی تمام عمر حکومت کی خدمت میں گزری۔ لیکن فطرت نے جو ذوق شعر و ادب عطا فرمایا تھا۔ اس کی نشو و نما اور مظاہرہ برابر ہوتا رہا۔ آپ کے اشعار کی خصوصیت سادگی و پرکاری ہے۔ مشکل سے کوئی شعر ایسا ملے گا جس میں مبالغہ،

تصنع، یا ایہام ہو۔ ان کی شاعری سادہ زبان میں لطیف شاعرانہ لطائف ہیں۔ جو ان کی زبان سے نکل کر آن کی آن میں زبان زد خلایق ہو جاتے ہیں۔ اُن کے مشہور قطعہ "گویند مرا چو زاد مادر" کے متعلق رشید یاسمی نے لکھا ہے "کمتر شعر فارسی از قدیم و جدید می شناسم کہ باین سرعت رائج گشتہ و وردِ زبانہا شدہ باشد و ندرۃً طفلے از نسل حاضر دیدہ میشود کہ آنرا از بر نخواند، نگارندہ دریں خصوص گفتہ است۔

شعر تو غم زمانہ بر باد دہد — ناشاداں را دل خوش و شاد دہد
مادر چو زباں کشود طفلش بسخن — "گویند مرا" بطفل خود یاد دہد"

نمونۂ کلام یہ ہے۔

قصہ شنیدم کہ بو العلا بہ ہمہ عمر — لحم نہ خورد و ذوات لحم نیازرد
در مرض موت با جازۂ دستور — خادمکے جوجہ بابہ محضر او برد
خواجہ چوں آں مرغ کشتہ دید برابر — اشک تحسّر ز ہر دو دیدہ بیفشرد
گفت بطفلیز از چہ شیر شرزہ نگشتی — تا نہ تواند کست بخوں کشد و خورد

مرگ برائے ضعیف امر طبیعی است
ہر قوی اول ضعیف گشت پس مرد

فرخی یزدی
۱۸۸۸ء

میرزا فرخی ۱۸۸۸ء میں یزد میں پیدا ہوئے۔ اور علوم متداولہ میں کمال حاصل کر کے کسب معاش میں مصروف ہو گئے۔ تحریک آزادی کے شروع ہوتے ہی سب کچھ چھوڑ کر اس میں شامل ہوئے۔ اسی سلسلہ میں ۱۹۱۲ء میں جشنِ نوروز کے موقعہ پر ایک مسدس لکھا۔ جس میں ایران کی سیاسی حالت اور مستبدانہ حکومت کے مظالم جی کھول کر بیان کئے :۔

عید جم شد اے فریدوں خوبیت ایراں پرست — مستبدی خوئے ضحاکی است ایں خود پرست
حالیا کز سلم و تور انگلیس و روس ہست — ایرج ایراں سراپا دستگیر و پائے بست

بہ کہ از راہ تمدن ترک بے مہری کنی
در رہ مشروطہ اقدام منوچہری کنی

اس مسدس نے ایران میں آگ لگا دی۔ عوام کے جذبات میں ہیجان برپا کر دیا۔ حاکم یزد اس کے اثرات مابعد سے لرز اٹھا اور شدت غضب میں حکم دیا کہ یزدی کا منہ سی کر قید میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک فرخی قید و زخم کی دوگونہ مصیبت میں گرفتار رہے۔ لیکن یہ ظلم ان کے جوش کو کم نہ کر سکا بلکہ رہا ہو کر اور شدت کے ساتھ خدمت ملک میں مصروف ہو گئے۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں بغداد اور کربلا چلے گئے۔ وہاں سے نکالے گئے تو موصل پہنچے اور پھر ایران واپس آ گئے۔ یہاں آ کر روسیوں نے قید کر دیا اس سے رہائی ملی تو سید ضیاء الدین وزیر وقت نے قید کر لیا۔ ان آفات سے نجات پا کر ۱۹۲۱ء میں اپنے عہد کا بہترین ادبی سیاسی اخبار طوفان جاری کیا۔

انقلاب روس کا دسواں جشن ماسکو میں بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ آقائے یزدی، آقائے شیردانی اور شاہزادہ سلیمان مرزا روسی حکومت کی دعوت پر اس جشن میں شریک ہوئے۔ فرخی نے سفر روس کا حال اپنے اخبار طوفان میں شائع کرنا شروع کیا مگر حکومت نے اخبار بند کر دیا اور اس طرح یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

۱۹۱۸-۲۰ء میں آپ یزد کے نمایندہ کی حیثیت سے مجلس ملی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور جماعت مخالف کے لیڈر بن گئے۔ اس وقت مجلس میں حکومت پرستوں کی کثرت تھی۔ یزدی ہر وقت ان سے برسر پیکار رہتے۔ اور قومی مفاد کے لئے باوجود اقلیت میں ہونے کے برابر لڑتے رہتے تھے۔ آپ نے اپنی عمر قومی خدمات کے لئے وقف کر دی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر کے قوم پرستوں میں یزدی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور انھوں نے قومی مفاد کے لئے جو قربانیاں کی ہیں وہ تاریخ انقلاب ایران میں زرین حروف سے لکھی جائیں گی۔

آپ کے کلام میں اس بلا کا جوش و خروش ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طوفانی دریا ہے جو موجیں مارتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ چونکہ زود گو ہیں۔ اس لئے ذخیرۂ کلام بھی بہت کافی ہے۔ نمونہ یہ ہے۔

گر خدا خواہد بجوشد بحرِ بے پایانِ خون — می شوند این ناخدایان غرق در طوفانِ خون
باسرافرازی نہم پا در طریقِ انقلاب — انقلابی چوں شوم دستِ من و دامانِ خون
کارگر را بہر دفع کارفرمایان چو تیپ — باسر شمشیر خونیں می دہم فرمانِ خون
کلبۂ بے سقفِ دہقاں را چو آرم در نظر — کاخہائے سر بکیواں را کنم ایوانِ خون
فرخی را شیر گیر انقلابی خواندہ اند — زانکہ خورد از شیرخواری شیر از پستانِ خون

بدیع الزماں خراسانی
۱۹۰۰ء

بدیع الزماں خراسانی، آقا شیخ علی کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں بمقام بشرویہ پیدا ہوئے۔ مشہد میں فارسی، عربی، منطق اور حکمت کی تعلیم فضلائے عصر مثلاً ادیب نیشاپوری، شیخ حسین نجم آبادی اور آقائے سید کاظم سے حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں طہران آگئے۔ دانش سرائے عالی میں ادبیاتِ فارسی کے معلم ہوئے۔ جس وقت مدرسہ سپہ سالار، دانش کدہ معقول و منقول میں تبدیل ہوا اور وزارت معارف نے اس سلسلہ میں جدید تقرر کئے تو آقائے بدیع الزماں نائب پرنسپل کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد جب طہران یونیورسٹی میں خطابت کا شعبہ کھولا گیا تو بدیع الزماں اس کے صدر مقرر ہوئے۔

آپ کی تصانیف میں تاریخ ادبیات فارسی (دو جلد) سخن و سخنوران کے نام سے ایک کتاب منتخب ادبیاتِ فارسی اور ایک ترجمہ موسومہ بہ حال و فلسفہ جلال الدین محمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کو قدرت نے غیر معمولی حافظہ اور ذہن عطا کیا ہے۔ زبان میں ایسا جادو ہے کہ آپ کی تقریریں ایران میں جوشِ بیان، شیرینی کلام کے ضرب المثل ہیں۔

آپ کے مشہور قصیدہ صبحدم کے چند اشعار بطور نمونہ کلام درج کئے جاتے ہیں

صبح آمد و لرزہ بہ ہوا افگند — خور پرتو مہر بہ سما افگند
یک رشتہ نور از افق بنمود — زاں رشتہ بروں ہزار تا افگند

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہُوا
سب چاند ستارے ماند ہُوئے خورشد کا نورُ ظہُور ہُوا

نغمۂ فردوس کی اشاعتِ نو کے بعد
مشہور زمانہ نظم "جوگی" کے شاعر پر ایک تحقیق

خوشی محمّد ناظر

فن اور شخصیّت

اپنے عہد کے اس منفرد شاعر کے حالاتِ زندگی، قومی خدمات
اور مختلف حوالوں سے یکجا کیا ہُوا اُن کا وہ کلام "جو نغمۂ فردوس"
میں شامل نہیں

مُرتّب:
امین الدّین قدیر

ناشر: مکتبہ فانوس سٹریٹ ۲ گورد ارجن نگر لاہور